جنوری 96

تدبّر

زیرِ نگرانی

مولانا امین احسن اصلاحی

یکے از مطبوعات

ادارہ تدبّرِ قرآن و حدیث

لاہور - پاکستان

نئے مطبوعات

مولانا امین احسن اصلاحی کی درج ذیل تصانیف مطالعہ فرمائیے:

○ فلسفے کے بنیادی مسائل قرآن حکیم کی روشنی میں =/ ۵۶ روپے

موضوعات: خدا کی ذات وصفات۔ کائنات میں انسان کا مقام۔ خیروشر۔ جبرواختیار۔ آخرت اور جزا وسزا۔ نظام نبوت۔

○ مقالاتِ اصلاحی۔ جلد اوّل =/ ۸۷ روپے

موضوعات:

اسوۂ حسنہ۔ جماعت اسلامی سے علیحدگی کی بنیادیں۔ معاشرہ کی اصلاح کا منہاج۔ مغربی تہذیب سے مرعوبیت کے اثرات۔

○ اسلامی قانون کی تدوین =/ ۴۲ روپے

○ مجموعہ تفاسیر فراہی (مصنفہ امام فراہیؒ) =/ ۱۷۶ روپے

○ تفہیمِ دین =/ ۵۴ روپے

موضوعات:

قرآنیات۔ تحقیقِ حدیث وسنت۔ فلسفۂ دین
اسلامی نظام اجتماعی۔ قومی و ملی معاملات۔

فاران فاؤنڈیشن

۱۲۲۔ فیروز پور روڈ۔ اچھرہ۔ لاہور ۵۴۶۰۰
فون۔ ۴۸۰۸۰۰

تدبّر

جنوری ۱۹۹۴ء	سلسلہ نمبر ۴۵	رجب ۱۴۱۴ھ

فہرست

تذکرہ و تبصرہ

انتخابی نتائج اور دینی جماعتیں ________ خالد مسعود ۳

تدبر قرآن

تفسیر سورہ یوسف (۲) ________ خالد مسعود ۶

تدبر حدیث

حصول علم کے آداب ________ امین احسن اصلاحی / سعید احمد ۱۳

زمینوں کے متعلق فیصلے ________ امین احسن اصلاحی / سعید احمد ۲۳

افادات فراہی

قرآن میں تدبر و تفکر کا مقام ________ خالد مسعود ۳۱

اسالیب قرآن

حذف فعل ________ خالد مسعود ۳۹

مجلسِ ترتیب

○ خالد مسعود (مدیر)
○ عبداللہ غلام احمد
○ ماجد خاور
○ محبوب سبحانی
○ سعید احمد

ناشر ——— ادارہ تدبر قرآن و حدیث
رحمان سٹریٹ، مسلم کالونی، سمن آباد، لاہور
مطبع ——— المطبعۃ العربیہ لاہور
قیمت -/8 روپے

تذکرہ و تبصرہ
خالد مسعود

انتخابی نتائج اور دینی جماعتیں

اکتوبر 93ء کے انتخابات کے نتیجہ میں پاکستان پیپلز پارٹی دوسری چھوٹی پارٹیوں اور آزاد ارکان اسمبلی کی حمایت سے حکومت حاصل کرنے میں کامیاب رہی جبکہ پاکستان مسلم لیگ کو حزب اختلاف کی حیثیت حاصل ہوئی۔ انتخابات سے ذرا پہلے مسلم لیگ کا ایک دھڑا عملاً پیپلز پارٹی کا ہم سفر اور معاون بن گیا اور بعض اہم دینی جماعتوں نے بھی اسی پارٹی کا ساتھ دیا اس لئے انتخابی نتائج کچھ زیادہ غیر متوقع نہیں رہے۔ انتخابی تجزیوں سے یہ دلچسپ حقیقت بھی سامنے آئی ہے کہ اگرچہ پیپلز پارٹی کے بارے میں پروپیگنڈا اور تاثر غریب عوام کی نمائندہ جماعت کا ہے لیکن ملک کے جاگیردار طبقہ میں اسی پارٹی کو پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔ چنانچہ جن علاقوں میں جاگیرداریاں اور بڑی زمینداریاں ہیں ان علاقوں سے وڈیرے پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر کامیاب ہوتے ہیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ مسلم لیگ کے اقتدار میں ان طبقات کو اپنے مفادات کے لئے خطرہ نظر آیا ہے۔

ہمارے لیے انتخابات کا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ ان میں دینی جماعتوں کے نمائندے بہت کم کامیاب ہوئے ہیں اس لیے خطرہ ہے کہ حکومت کے ایوانوں میں اہل دین کی آواز بہت کم پہنچے گی اور نہایت کمزور بھی ہوگی۔ ماہرین شماریات کے اندازہ کے مطابق پورے ملک میں دینی سیاسی جماعتوں کو کل تیرہ لاکھ ووٹ ملے جو ڈالے گئے ووٹوں کا 7 ۔ 6 فیصد یعنی صرف پندرھواں حصہ ہیں۔ اس طرح ان کے کل نو نمائندے قومی اسمبلی میں جاسکے۔ اپنی جماعتوں کی اس ناکامی پر اسلام دشمن لوگوں نے بغلیں بجاتے ہوئے یہ کہا ہے کہ پاکستان میں اسلام کی گرفت کمزور اور اسلامی بنیاد پرستی کو شکست ہوئی ہے۔ اس پروپیگنڈا کا جواب یہ دیا گیا ہے اور یہ ہمارے خیال میں درست بھی ہے کہ انتخابات میں اسلام بطور قضیہ پیش نظر تھا ہی نہیں۔ ووٹ اسلام کے رد و قبول کے لئے نہیں بلکہ انتظام مملکت کو چلانے کے لئے ڈالے گئے تھے۔ عوام نے ملک کو درپیش مسائل کے حل کے لئے جن لوگوں کو موزوں سمجھا ان کو منتخب کیا۔ لہذا اسلام کے حوالہ سے انتخابی نتائج کو کسوٹی بنانا ایسا کرنے والوں کی بدنیتی کا مظہر ہے۔

تاہم چونکہ مذہبی جماعتیں سیاسی اکھاڑے میں اتریں اور ان کے ہاں کامیابی کا تناسب کم رہا اس لئے ضروری ہے کہ اہل دین اپنی کمزوریوں پر نگاہ رکھنے کے لئے ان وجوہ کا تعین کریں جن کے باعث مذہبی طبقہ کو انتظام حکومت کے لئے موزوں نہیں پایا گیا۔ ہمارے نزدیک یہ وجوہ حسب ذیل ہیں:

(الف)۔ علماء منبر و محراب سے وابستہ ہوتے ہیں اور وہ بالعموم مساجد ہی کو انتخابی مہم کا محور و مرکز بناتے ہیں۔ عملاً صورت حال یہ ہے کہ عوام کی کثیر تعداد مساجد کی حاضری سے کوئی رغبت نہیں رکھتی لہٰذا اس تک علماء کی آواز بھی نہیں پہنچتی۔ انتخابات کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ امیدوار اپنے حلقہ کے ایک ایک ووٹر تک پہنچے اور جہاں برادریاں موثر ہوں وہاں جوڑ توڑ کے ذریعے برادریوں کی معاونت حاصل کرے۔ علماء چونکہ ایسا کرنے سے قاصر رہتے ہیں اس لئے ان کو عوام الناس میں پذیرائی نہیں ملتی۔

(ب)۔ علماء نے اپنے منشوروں میں بالعموم جن مسائل کو اجاگر اور اپنی مہم کا موضوع بنایا وہ نہایت محدود نوعیت کے تھے جن کی افادیت عوام الناس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اس سے بالعموم یہ تاثر قائم ہوا کہ علماء میں قومی تقاضوں کے شعور کا فقدان ہے۔ قوم ان سے وسیع دائرے میں رہنمائی کی طالب تھی اور وہ اس طلب کو پورا نہ کرسکے۔

(ج)۔ جن دینی جماعتوں نے اپنے منشوروں میں قومی مسائل کا تذکرہ کیا بھی تو اس کو سیاسی پارٹیوں کی نقالی سمجھا گیا اور ان کو محض انتخابی نعرے اور خالی دعوے سے زیادہ اہمیت نہیں دی گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دینی جماعتوں کے پاس قومی مسائل کے حل کے لئے کوئی واضح پروگرام نہیں تھا۔ لوگ سمجھتے تھے کہ نعروں اور دعووں کو حقیقت بنانے کے لئے جس ہوم ورک کی ضرورت ہے وہ علما نے خود نہیں کیا اور اس کے لئے جو منصوبہ بندی مطلوب ہے وہ اس کی اہلیت نہیں رکھتے۔ اس کی بڑی وجہ جدید نظام معیشت کے مسائل سے ان کا ناآشنا ہونا اور ریاست کے تقاضوں کو نہ سمجھنا ہے۔

(د)۔ بعض دینی جماعتوں نے دین و اخلاق ہر چیز کو خیرباد کہہ کر دنیا دار سیاست دانوں کے طور طریقے اپنا لیے۔ انہوں نے عوام کو متاثر کرنے کے لئے جھوٹے نعروں، فلمی طرز کے گانوں، سوانگ اور رقص تک کا سہارا لیا۔ ان کی نہایت غیر سنجیدہ بلکہ غیر اخلاقی مہم یہ ظاہر کرنے کے لئے کافی تھی کہ یہ لوگ خود دینی و اخلاقی اقدار کا کتنا لحاظ رکھنے والے ہیں اور ان کی اصول پسندی کی حدود کیا ہیں۔ ان کے اخلاق باختہ رویہ نے عوام کو دینی طبقہ سے مایوس ہی نہیں بلکہ متنفر کیا۔ اس نفرت کا اظہار انہوں نے دینی جماعتوں کے نمائندوں کو ووٹ نہ دے کر کیا۔

فی الجملہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان انتخابات نے اپنی جماعتوں کو یہ سبق دیا ہے کہ عوام اپنے دینی رہنماؤں کو باوقار، بااخلاق اور بااصول دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ علماء ان کے لئے علم دین کی شمع روشن رکھیں، ان کی تعمیر سیرت کے کاموں میں منہمک ہوں، ملک کو درپیش جدید مسائل کے حل میں ان کی رہنمائی کریں اور سیاست کے شیطانی کھیلوں میں ملوث ہو کر اپنے آپ کو بے آبرو نہ کریں۔ یہ کام ظاہر ہے انتخابی سیاست سے نہیں ہوسکتے۔ ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے گہرے علم اور مجتہدانہ بصیرت کی ضرورت ہے۔ اگر علما یہ ذمہ داری پوری کرسکیں تو قوم ہی نہیں پوری امت ان کی مرہون منت ہوگی۔

بقیہ : حصولِ علم کے آداب

وضاحت:

تخونا کا ٹھیک ترجمہ تنفر نا سے کیا جاتا ہے لہٰذا اس کے یہ معنی ہوں گے کہ حضورؐ اہتمام رکھتے تھے کہ صحابہ کو اس طور پر نصیحت کریں کہ وہ "بور" نہ ہونے پائیں یعنی متنفر یا بیزار نہ ہوں۔
علم سکھانے کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ ٹھونسنے کی کوشش نہ کی جائے بلکہ ناغہ کرکے لوگوں کو نصیحت یا تعلیم دی جائے۔ آنحضرتؐ حالات کو بھی ملحوظ رکھتے اور یہ بھی دیکھ لیتے کہ وقت موزوں ہے یا نہیں۔

(ترتیب: سعید احمد)

خالد مسعود

تفسیر سورۂ یوسف (۲)

اور یوسف کے بھائی آئے اور اس سے ملے۔ اس نے تو ان کو پہچان لیا پر وہ اس سے ناآشنا ہی رہے○ اور جب اس نے ان کا سامان تیار کر دیا کہا کہ اب کے اپنے سوتیلے بھائی کو بھی میرے پاس لائیو۔ دیکھتے ہو نا کہ میں غلہ بھی پورے پیمانہ سے دیتا ہوں اور بہترین میزبانی کرنے والا بھی ہوں○ اور اگر تم اس کو میرے پاس نہیں لاؤ گے تو نہ تمہارے لئے میرے پاس غلہ ہے اور نہ تم میرے پاس پھٹکنا ۳۶○ انہوں نے کہا ہم اس کے بارے میں اس کے باپ کو راضی کرنے کی کوشش کریں گے اور ہم یہ ضرور کریں گے○ ۶۱

اور اس نے اپنے نوجوانوں کو حکم دیا کہ ان کا دیا ہوا مال ان کے کجاووں ہی میں ڈال دو کہ جب وہ اپنے اہل و عیال میں پہنچیں اس کو پہچانیں تاکہ وہ پھر آئیں○ تو جب وہ اپنے باپ کے پاس لوٹے انہوں نے کہا کہ ابا جان! ہم آگے کو غلہ سے محروم کر دیئے گئے ہیں تو ہمارے ساتھ ہمارے بھائی کو بھی جانے دیجیے کہ ہم غلہ لائیں اور ہم اس کی حفاظت کا عہد کرتے ہیں○ اس نے کہا کہ اس کے معاملے میں تم پر میرا اعتماد نہیں ہو گا مگر ویسا ہی جیسا کہ میں نے اس سے پہلے اس کے بھائی کے معاملے میں تم پر کیا۔ تو اللہ بہترین محافظ اور وہ سب سے بڑھ کر رحم فرمانے والا ہے ۳۷○۶۴

۳۶۔ یہ واقعہ اس زمانہ کا ہے جب قحط شروع ہو چکا تھا اور لوگ سرکاری ڈپو سے غلہ پاتے تھے۔ بیرون ملک سے آنے کے باعث ان بھائیوں کو اجازت نامہ حاصل کرنے کے لئے حضرت یوسفؑ کے پاس آنا پڑا ہو گا۔ جب انہوں نے بن یمین کے حصہ کا راشن مانگا تو حضرت یوسفؑ نے ہدایت کی ہو گی کہ وہ خود حاضر ہو ورنہ اس کے حصہ کا راشن نہیں دیا جائے گا۔

۳۷۔ مطلب یہ کہ تمہارے اوپر اعتماد کا تجربہ تو مجھے ہو چکا ہے۔ البتہ اگر بن یمین کو تمہارے ساتھ بھیجنا ہی پڑا تو میں یہ کام اللہ کی حفاظت و رحمت کے بھروسہ پر کروں گا۔

اور جب انہوں نے اپنا سامان کھولا تو دیکھا کہ ان کی پونجی بھی ان کو لوٹا دی گئی ہے۔ بولے ابا جان! اب ہمیں کیا چاہیے' یہ ہماری پونجی بھی ہمیں لوٹا دی گئی ہے' اب ہم جائیں گے' اپنے اہل و عیال کے لئے رسد لائیں گے' اپنے بھائی کی حفاظت کریں گے' ایک بار شتر غلہ زیادہ حاصل کریں گے ۳۸ یہ غلہ تو تھوڑا ہے○ اس نے جواب دیا کہ میں اس کو تمہارے ساتھ ہرگز نہ بھیجوں گا جب تک تم مجھ سے خدا کے نام پر عہد نہ کرو کہ تم اس کو میرے پاس ضرور واپس لاؤ گے الا آنکہ تم کہیں گھر ہی جاؤ۔ تو جب انہوں نے اس کو اپنا پکا قول دے دیا اس نے کہا جو قول و قرار ہم کر رہے ہیں اللہ اس پر نگہبان ہے○ ۶۶

اور اس نے ہدایت کی کہ اے میرے بیٹو، سب ایک ہی دروازے سے نہ داخل ہونا' الگ الگ مختلف دروازوں سے داخل ہونا۔ ۳۹ اور میں اللہ کے مقابل میں تمہارے کچھ کام نہیں آسکتا' اختیار تو بس اللہ ہی کا ہے۔ میرا بھروسہ اسی پر ہے اور بھروسہ کرنے والوں کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہیے○ اور جب وہ داخل ہوتے جہاں سے ان کے باپ نے ان کو ہدایت کی تھی تو وہ اللہ کے مقابل میں ان کے کچھ کام آنے والا نہ تھا۔ بس یعقوب کے دل میں ایک خیال تھا جو اس نے پورا کر لیا۔ ۴۰ اور وہ بے شک اس علم سے بہرہ ور تھا جو ہم نے اس کو سکھایا تھا لیکن اکثر لوگ علم نہیں رکھتے○ ۶۸

اور جب یہ لوگ یوسف کے پاس پہنچے اس نے اپنے بھائی کو خاص اپنے پاس جگہ دی۔ بتایا کہ میں تو تمہارا بھائی ہوں تو جو کچھ یہ کرتے رہے ہیں اس سے آزردہ خاطر نہ ہو جیو ۴۱○ پس جب ان کا سامان

۳۸۔ یعنی رقم واپس مل جانے کے بعد ہماری راہ میں کیا رکاوٹ باقی رہی۔ اب تو ہم ضرور ہی جائیں گے اور اپنے اہل و عیال کے لئے غلہ لائیں گے۔ ان کی خوشی فقرے فقرے سے ابلی پڑتی ہے۔

۳۹۔ حضرت یعقوبؑ نے یہ ہدایت اس اندیشہ سے فرمائی ہو گی کہ ایک ہی وقت میں ایک ہی دروازے سے گیارہ ذی وجاہت اور باوقار بھائیوں کا شہر میں داخل ہونا شریروں کی توجہ ان کی جانب کرنے کا باعث نہ ہو اور وہ ان کو نقصان پہنچانے کے درپے نہ ہو جائیں۔

۴۰۔ یہ تقدیر اور تدبیر کا تعلق واضح فرمایا ہے کہ تقدیر اٹل ہے جس کو تدبیر نہیں بدل سکتی۔ اس کے باوجود انسان کا فرض ہے کہ حالات و مصالح کے مطابق تدابیر اختیار کرے، جیسا کہ اس معاملہ میں حضرت یعقوبؑ نے کیا۔ اسی میں اس کے ارادے اور سعی و عمل کا امتحان ہے اور اسی پر آخرت میں اس کے درجے اور مرتبے کا انحصار۔

۴۱۔ قرینہ دلیل ہے کہ اپنا تعارف کرانے کے بعد حضرت یوسفؑ نے بن یمین کے حالات سے آگاہی حاصل کی اور اب ان کو کسی قیمت پر ظالم بھائیوں کے ہمراہ واپس بھیجنے کا خطرہ مول لینے پر

تیار کرا دیا کٹورا اپنے بھائی کے کجاوے میں رکھوا دیا۔ پھر ایک منادی نے آواز دی کہ اے قافلہ والو تم لوگ چور ہو○ انہوں نے ان کی طرف مڑ کر پوچھا، تمہاری کیا چیز کھوئی گئی ہے○ انہوں نے کہا ہم شاہی پیمانہ نہیں پا رہے ہیں۔ اور جو اس کو لاتے گا اس کے لئے ایک بار شتر غلہ ہے اور میں اس کا ضامن ہوں○ انہوں نے کہا: خدا کی قسم! آپ لوگ جانتے ہیں کہ ہم اس ملک میں اس لئے نہیں آتے کہ فساد برپا کریں اور ہم چوری کرنے والے لوگوں میں سے نہیں○ انہوں نے کہا کہ اگر تم جھوٹے ثابت ہوتے تو اس چوری کرنے والے کی کیا سزا ہے○ وہ بولے اس کی سزا؟ جس کے کجاوے میں چیز ملے وہ اس کی سزا میں دھر لیا جائے۔ ہم ایسے ظالموں کو اسی طرح سزا دیا کرتے ہیں ۴۲○ پس اپنے بھائی کے تھیلے سے پہلے ان کے ساتھیوں سے تفتیش کا آغاز کیا۔ پھر اس کو اپنے بھائی کے تھیلے سے برآمد کر لیا۔ اس طرح ہم نے یوسف کے لئے تدبیر کی۔ وہ بادشاہ کے قانون کی رو سے اپنے بھائی کو پکڑنے کا مجاز نہ تھا مگر یہ کہ اللہ چاہے۔ ہم جس کو چاہتے ہیں درجے پر درجے بلند کرتے ہیں اور ہر علم والے سے بالاتر ایک علم والا ہے○ ۷۶

انہوں نے کہا اگر یہ چوری کرے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اس سے پہلے اس کا ایک بھائی بھی چوری کر چکا ہے۔ یوسف نے اس بات کو اپنے دل ہی میں رکھا، اس کو ان پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ دل میں کہا تم خود ہی بد قماش لوگ ہو۔ اور جو کچھ تم بیان کر رہے ہو اللہ اس کو خوب جانتا ہے○ انہوں نے کہا، اے عزیز! اس کا ایک باپ ہے جو بہت بوڑھا ہے تو آپ اس کی جگہ ہم میں سے کسی کو روک لیجئے۔ ۴۳ ہم آپ کو نہایت ہی محسن سمجھتے ہیں○ اس نے کہا، اللہ پناہ میں رکھے اس بات سے کہ ہم اس کے سوا تیار نہ ہوتے۔ چنانچہ بھائی کو بتا دیا کہ وہ ان کو روکنے کے لئے ایک تدبیر اختیار کرنے والے ہیں۔

۴۲۔ تدبیر جو مصلحت حق کی خاطر اختیار کی گئی توریہ کی قسم کی تھی جس میں ہر بات بجائے خود بھی اور صحیح تھی لیکن اس کے کہنے یا کرنے کے انداز سے فریق ثانی کو مغالطہ ہوا۔ اس میں نہ حضرت یوسفؑ کسی جھوٹ میں ملوث ہوتے نہ ان کے آدمی۔ البتہ وقتی طور پر بن یمین پر ایک الزام کا دھبہ لگا لیکن انہی کو سوتیلے بھائیوں کے ظلم وستم سے بچانے ہی کے لئے تو یہ تدبیر اختیار کی گئی تھی اور ان کو پہلے آگاہ بھی کر دیا گیا تھا۔ اس تدبیر سے ملکی قانون کا احترام بھی باقی رہا اور بھائیوں کے اپنے قول کی رو سے حضرت یوسفؑ بن یمین کو روک لینے کے مجاز ہو گئے۔ ان وجوہ کی بنا پر اس تدبیر کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب فرمایا۔

۴۳۔ برادران یوسف نے اپنی شرمندگی مٹانے کے لئے پہلے تو حضرت یوسفؑ پر چوری کی ایک تہمت جڑ دی اور یہ تاثر دیا کہ بن یمین چوری کی خصلت اپنی ماں کی طرف سے لایا ہے۔ اس کے

کسی کو پکڑیں جس کے پاس ہم نے اپنی چیز پائی ہے۔ اس صورت میں ہم نہایت ظالم ٹھہریں گے○ جب وہ اس سے مایوس ہو گئے تو آپس میں مشورہ کرنے الگ ہوتے۔ ان کے بڑے نے کہا ۴۴ کیا تم کو علم نہیں کہ تمہارے باپ نے اللہ کے نام پر تم سے مضبوط قول و قرار لیا ہے اور اس سے پہلے یوسف کے معاملے میں جو تقصیر تم سے سرزد ہو چکی ہے وہ بھی تمہارے علم میں ہے تو میں تو اس سرزمین سے ٹلنے کا نہیں جب تک میرے باپ مجھے اجازت نہ دیں یا اللہ میرے لئے کوئی فیصلہ فرماتے اور وہی بہترین فیصلہ فرمانے والا ہے○ تم لوگ اپنے باپ کے پاس جاؤ اور ان سے کہو کہ اے ہمارے باپ! آپ کے بیٹے نے چوری کی اور ہم نے وہی بات کہی ہے جو ہمارے علم میں آئی، ہم غیب کے نگہبان نہیں ہیں○ اور آپ بستی کے لوگوں سے پوچھ لیجئے جس میں ہم رہے ہیں اور اس قافلے سے بھی پوچھ لیجیے جس میں ہم آتے ہیں اور ہم بالکل سچے ہیں○ اس نے کہا بلکہ تمہارے دل نے یہ بات گھڑ لی ہے تو صبر جمیل ہی اولیٰ ہے۔ امید ہے اللہ ان سب کو میرے پاس لائے گا ۴۵ بے شک وہی علیم و حکیم ہے○ ۸۳

اور اس نے ان سے منہ پھیرا اور کہا ہائے یوسف! اور غم سے اس کی آنکھیں سفید پڑ گئیں اور وہ گھٹا گھٹا رہنے لگا ۴۶ وہ بولے کہ بخدا آپ یوسف ہی کی یاد میں رہیں گے یہاں تک کہ از کار رفتہ ہو کے رہ جائیں گے یا ہلاک ہی ہو جائیں گے○ اس نے کہا میں اپنی پریشانی اور اپنے غم کا شکوہ اللہ ہی

بعد خوشامد کرنے لگے کہ آپ بڑے محسن ہیں۔ ہم میں سے کسی کو روک کر اس کو رہا کر دیجئے۔

۴۴۔ بڑے سے عمر میں بڑا مراد لینا ضروری نہیں بلکہ درجہ اور مرتبہ یا عقل ورائے میں بڑا مراد لینا زیادہ اقرب ہے۔ تورات میں اس بھائی کا نام یہوذا آیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس کے دل میں حضرت یوسفؑ کے لئے کوئی نرم گوشہ تھا۔ غالباً اسی نے ان کے قتل کے بجائے کنوئیں میں ڈالنے کا مشورہ بھی دیا ہو گا تاکہ قتل کے گناہ سے بچ جائیں۔

۴۵۔ اللہ اپنے بندوں کو ان کی طاقت سے زیادہ نہیں آزمایا کرتا۔ اس لئے آزمائش کی شدت اللہ کی رحمت کی امید کو قوت پہنچاتی ہے۔ جب حضرت یعقوبؑ نے دیکھا کہ وہ یوسف کے بعد بن یمین اور یہوذا سے بھی محروم ہو گئے تو انہیں دفعتاً یہ روشنی نظر آئی کہ اب انشاء اللہ سب کے جمع ہونے کا وقت قریب آ گیا ہے۔

۴۶۔ رونا دھونا وہ برا ہوتا ہے جو خدا کے سوا کسی اور کے آگے ہو، جو امید کے بجائے یاس کا مظہر ہو اور جس میں انسان اپنی بے صبری کا اظہار اس طرح کرے جس سے ایمان اور توکل مجروح ہو۔ اللہ کے آگے رونا اس کی رحمت کو جوش میں لانے کا باعث ہوتا ہے۔

سے کرتا ہوں اور میں اللہ کی جانب سے وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ۸۶○ اے میرے بیٹو! جاؤ یوسف اور اس کے بھائی کی ٹوہ لگاؤ اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ اللہ کی رحمت سے مایوس تو بس کافر ہی ہوتے ہیں○ ۸۷

تو جب وہ اس کے پاس پہنچے، انہوں نے اس سے کہا کہ اے عزیز! ہم اور ہمارے اہل و عیال بڑی تکلیف میں مبتلا ہیں اور ہم تھوڑی سی پونجی لے کر حاضر ہوتے ہیں تو آپ ہمیں غلہ بھی پورا دیجئے اور ہم کو صدقہ بھی عنایت فرمایئے۔ اللہ تعالیٰ صدقہ کرنے والوں کو بدلہ عنایت فرماتا ہے○ اس نے کہا، تمہیں کچھ پتہ ہے کہ تم جہالت میں مبتلا ہو کر یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا کچھ کر گزرے ہو ۸۹○ وہ بولے کہ کیا آپ واقعتاً یوسف ہی ہیں! اس نے کہا میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے۔ اللہ نے ہم پر اپنا فضل فرمایا۔ بے شک جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں اور ثابت قدم رہتے ہیں تو اللہ خوب کاروں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا ۹۰○ وہ بولے کہ خدا کی قسم اللہ نے آپ کو ہم پر برتری بخشی اور بے شک ہم ہی غلطی پر تھے۔ اس نے کہا اب تم پر کچھ الزام نہیں۔ اللہ تم کو معاف کرے۔ ۵۰ وہ ارحم الراحمین ہے○ تم میرا یہ کرتا لے جاؤ، میرے باپ کے چہرے پر ڈال دیجیو وہ دیکھنے لگیں گے اور تم لوگ اپنے تمام اہل و عیال کے ساتھ میرے پاس آجاؤ○ ۹۳

اور جب قافلہ چلا ان کے باپ نے کہا کہ اگر تم لوگ مجھے خبطی نہ قرار دو تو میں یوسف کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں○ لوگ بولے کہ خدا کی قسم آپ ابھی تک اپنے پرانے خبط ہی میں مبتلا ہیں○ پس جب

۴۷۔ یعنی خدا کے معاملہ میں میرا تجربہ یہ ہے کہ وہ مشکل کشا ہے اور مجھے اس کی تائید و رحمت کی روشنی نظر آرہی ہے۔

۴۸۔ بھائیوں کی بدحالی و پریشانی اور ان کی اس لجاجت آمیز درخواست، بالخصوص صدقہ کی درخواست نے حضرت یوسفؑ کے دل کو ہلا دیا۔ بیگانگی کا جو پردہ ان کے اور ان کے بھائیوں کے درمیان اب تک حائل تھا اس کو مزید برقرار رکھنا انہوں نے مناسب نہیں خیال فرمایا اس لئے ان کے رویہ کا شکوہ زبان پر لائے۔

۴۹۔ یہ حقیقت اس ساری سرگزشت کی روح ہے۔ تقویٰ اور صبر جس کے اندر احسان کی روح ہو بندے پر دنیا اور آخرت میں خدا کے فضل کا ضامن ہے۔

۵۰۔ کوئی شخص اگر سچے احساس ندامت کے ساتھ اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتا ہے تو ایک شریف ابن شریف اس کو معاف ہی کر دیتا ہے۔ یہی الفاظ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن قریش کے ان سرغنوں کو خطاب کر کے فرمائے جو برابر آپ کی دشمنی میں سرگرم رہے تھے۔

یوں ہوا کہ خوشخبری دینے والا آیا اس نے کرتا اس کے چہرے پر ڈال دیا، اس کی بصارت عود کر آئی تو اس نے کہا، کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں اللہ کی جانب سے وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ۵۱○ انہوں نے درخواست کی کہ ہمارے باپ ہمارے گناہوں کی مغفرت کے لئے دعا کیجئے۔ بے شک ہم ہی قصوروار ہوئے○ اس نے کہا میں جلد اپنے رب سے تمہارے لئے مغفرت کی دعا کروں گا، بے شک وہی بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے○ ۹۸

پس جب وہ یوسف کے پاس پہنچے اس نے اپنے والدین کو خاص اپنے پاس جگہ دی اور کہا مصر میں انشاء اللہ امن و چین سے رہئے○ اور اس نے اپنے والدین کو تخت پر بٹھایا اور سب اس کے لئے سجدہ میں گر پڑے ۵۲ اور اس نے کہا، اے میرے باپ! یہ ہے میرے پہلے کے خواب کی تعبیر۔ میرے رب نے اس کو سچ کر دکھایا اور اس نے بڑے ہی کرم کے ساتھ میری خبرگیری فرمائی جب کہ مجھے قید خانے سے نکالا اور آپ لوگوں کو دیہات سے لایا بعد اس کے کہ شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان فساد ڈلوا دیا تھا۔ بے شک میرا رب جو کچھ چاہتا ہے اس کے لئے نہایت باریک بین اور دقیقہ رس ہے۔ بے شک وہی علیم و حکیم ہے○ اے میرے رب! تو نے مجھے اقتدار میں سے بھی حصہ بخشا اور باتوں کی تعبیر کے علم میں سے بھی سکھایا۔ اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے، تو ہی دنیا اور آخرت دونوں میں میرا کارساز ہے۔ مجھے اسلام پر وفات دے اور نیکوکاروں کے زمرہ میں شامل کر○ ۱۰۱

یہ سرگزشت غیب کی خبروں میں سے ہے جس کی ہم تمہاری طرف وحی کر رہے ہیں اور تم تو ان کے پاس اس وقت موجود نہیں تھے جب کہ انہوں نے اپنی رائے پختہ کی اور وہ سازش کر رہے تھے○ ۱۰۲

۵۱۔ جس ضعف بصارت کا سبب غم و الم ہو اس کا علاج یہ ہے کہ کوئی ایسی چیز سامنے آئے جو نہ صرف اس سارے غم و الم کو دھو کر صاف کر دے بلکہ اس کی لائی ہوئی خوشی رگ رگ میں ایک حیات تازہ دوڑا دے۔ سچے جذبات کی تاثیر و تاثر کا یہ کرشمہ سامنے آیا کہ حضرت یعقوبؑ کی بصارت لوٹ آئی۔ اس پر انہوں نے بیٹوں کو یہ تعلیم دی کہ وہ صرف ظاہر کے غلام بن کر زندگی نہ گزاریں بلکہ اس کے اندر خدا کے مخفی ہاتھوں کی کارروائیوں پر بھی ایمان رکھیں۔

۵۲۔ سجدہ کے معنی فرمانبردارانہ جھکنے کے ہیں جو بڑوں کی تعظیم کا ایک معروف طریقہ رہا ہے۔ اگر کوئی شخص اس سے اصطلاحی سجدہ ہی مراد لے جب بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑتا کیونکہ یہ سجدہ غیر اللہ کے لئے اسلام میں حرام ہوا۔

اور ان لوگوں میں سے اکثر ایمان لانے والے نہیں ہیں خواہ تم ان کے ایمان کی کتنی ہی حرص کرو○ ۵۲ اور تم اس پر ان سے کوئی معاوضہ تو نہیں طلب کر رہے ہو۔ یہ تو بس دنیا والوں کے لئے ایک یاددہانی ہے○ اور آسمانوں اور زمین میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر سے یہ گزرتے ہیں تو ان سے منہ موڑے ہوئے○ اور ان میں سے اکثر اللہ پر ایمان نہیں رکھتے مگر اس طرح کہ ساتھ ہی اس کے شریک بھی ٹھہرائے ہوئے ہیں ۵۴○ کیا یہ لوگ اس بات سے نچنت ہیں کہ ان پر عذاب الٰہی کی کوئی آفت یا قیامت ہی اچانک آدھمکے اور وہ اس سے بالکل بے خبر ہوں○ ۱۰۷

کہہ دو، یہ میری راہ ہے۔ میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، پوری بصیرت کے ساتھ، میں بھی اور وہ لوگ بھی جنہوں نے میری پیروی کی ہے اور اللہ پاک ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں○ ۱۰۸

اور ہم نے تم سے پہلے بھی نہیں بھیجے مگر آدمی ہی انہی بستیوں والوں میں سے، ہم ان کی طرف وحی کرتے تھے۔ کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے کہ کیا انجام ہوا ان لوگوں کا جو ان سے پہلے تھے اور دار آخرت ان لوگوں کے لئے، بہتر ہے جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا تو کیا تم سمجھتے نہیں○ یہاں تک کہ جب یہ نوبت آگئی کہ رسول اپنی قوموں سے مایوس ہو گئے اور لوگوں نے یہ گمان کیا کہ ان کو جھوٹ ڈراوے سنائے گئے تو ان کو ہماری مدد آ پہنچی۔ ۵۵ پس نجات ملی ان کو جن کو ہم نے چاہا اور مجرموں سے ہمارے عذاب کو ٹالا نہیں جا سکتا○ ان کی سرگزشتوں میں اہل عقل کے لئے بڑا سامان عبرت ہے۔ یہ کوئی گھڑی ہوئی چیز نہیں بلکہ تصدیق ہے اس چیز کی جو اس سے پہلے موجود ہے اور تفصیل ہے ہر چیز کی اور ہدایت و رحمت ہے ایمان لانے والوں کے لئے○ ۱۱۱

۵۲۔ یعنی طبیعتوں میں اگر حق کو قبول کرنے کی رغبت اور صلاحیت ہو تو قرآن کے وحی الٰہی ثابت کر دینے کے لئے اس قصے کا بیان کر دینا ہی کافی ہے لیکن ان لوگوں کی اکثریت ایمان سے محروم ہی رہے گی۔

۵۴۔ یعنی ان میں جو اللہ کو مانتے بھی ہیں وہ اللہ کے ساتھ بہت سے شرکاء و شفعاء کو بھی مانتے ہیں۔ اس ضلالت کی موجودگی میں قرآن کے ڈراوے ان پر کیا اثر کر سکتے ہیں۔

۵۵۔ یہ عذاب کے لئے کفار کی جلد بازی کے جواب میں وضاحت فرمائی ہے کہ عذاب اس وقت آتا ہے جب اللہ کے رسول اپنی قوموں کے ایمان سے مایوس ہو جاتے ہیں اور ان کی قوم کے لوگ عذاب کی تاخیر کے سبب سے یہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ ان پر جھوٹ موٹ عذاب کی دھونس جمائی گئی تھی۔ اس وقت رسولوں کی مدد کے لئے ہماری مدد ظہور میں آتی ہے۔

تدبر حدیث

امین احسن اصلاحی

حصولِ علم کے آداب

(صحیح بخاری کی کتاب العلم کی روایات)

باب ۳۹۔ ماذکر فی المناولۃ وکتاب اھل العلم بالعلم الی البلدان وقال انس نسخ عثمان المصاحف فبعث بہا الی الافاق ورای عبداللہ بن عمرؓ ویحیی بن سعید ومالک ذالک جائزا واحتج بعض اھل الحجاز فی المناولۃ بحدیث النبی صلی اللہ علیہ وسلم حیث کتب لامیر السریۃ کتابا وقال لا تقراہ حتی تبلغ مکان کذا وکذا فلما بلغ ذالک المکان قراہ علی الناس واخبرھم بامر النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

■ ۔۔۔ مناولہ کا بیان اور اہل علم کا علمی باتوں کو لکھ کر دوسرے شہروں کو بھیجنا۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے قرآن مجید لکھوائے اور ان کو اسلامی مراکز میں بھیجا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ یحییٰ بن سعید اور امام مالکؒ نے اس کو جائز قرار دیا اور اہل حجاز کے بعض علما نے مناولہ پر اس حدیث سے استدلال کیا ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک فوجی دستے کے امیر کو خط لکھ کر دیا اور فرمایا کہ اس کو نہ کھولنا جب تک کہ فلاں جگہ نہ پہنچ جاؤ۔ جب وہ اس جگہ پہنچے تو انہوں نے اس خط کو لوگوں کے سامنے پڑھا اور ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی خبر دی۔

وضاحت:

پچھلے چند بابوں سے امام صاحب حدیث کی روایات کے ذرائع بتا رہے ہیں۔ جس طرح حدثنا، اخبرنا، قراۃ علی اور قرات علیہ حدیث منتقل کرنے کے ذرائع ہیں اسی طرح مناولہ بھی حدیث کی روایت کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ مناولہ کا اصل مفہوم تو لین دین ہے مگر جس طرح آپ خط لکھ کر ایک چیز منتقل کر دیتے ہیں کہ یہ روایت میں نے فلاں سے سنی ہے اور وہ معتبر طریقہ سے ملی ہے اور اگر وہ خط پہنچ گیا تو جس کو خط لکھا گیا اس کو حق حاصل ہو جائے گا کہ وہ اس کو روایت کرے۔ اس طریقہ کو مناولہ کہا جاتا ہے۔ اس پر حضرت انسؓ نے اس بات سے استشہاد کیا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے قرآن مجید لکھ کر اس

کے نسخے دوسرے شہروں کو بھجوائے۔ اس طرح سے حدیث یا حدیث کی کسی کتاب یا مجموعے کو بھی منتقل کر سکتے ہیں۔ حضرت انس کا یہ استدلال ٹھیک ہے۔ اس میں کوئی اعتراض کی بات نہیں۔

امام صاحب نے اسی مناولہ پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک روایت سے بھی استدلال کیا ہے کہ آپؐ نے ایک دستے کے امیر کو ایک خط لکھ کر دیا کہ اس کو فلاں جگہ پر پہنچنے سے پہلے نہ کھولنا۔ جب اس جگہ پہنچے تو اس خط کو کھولا اور دستے والوں کو سنایا کہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت ہے اور انہوں نے اس کو تسلیم کر لیا۔ یہ واقعہ سریہ عبداللہ بن جحش سے متعلق ہے۔ آنحضرتؐ نے امیر کو مکہ سے قریب نخلہ کے مقام پر گھات لگانے کا حکم دیا تھا۔ آپ نے ان کو جو خط دیا اس میں لکھا تھا کہ مہم پر اپنے ساتھیوں میں سے انہی لوگوں کو لے جائیں جو خوش دلی سے جانا چاہیں۔ کسی کو مجبور کر کے ساتھ نہ لے جائیں۔ امام صاحب نے اس واقعہ کو بھی مناولہ کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ میرے نزدیک مناولہ کا طریقہ روایت کو منتقل کرنے کا ایک صحیح طریقہ ہے۔

۶۴۔ حدثنا اسمٰعیل بن عبداللہ قال حدثنی ابراھیم بن سعد عن صالح عن ابن شہاب عن عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود ان عبداللہ بن عباس اخبرہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعث بکتابہ رجلا وامرہ ان یدفعہ الی عظیم البحرین فدفعہ عظیم البحرین الی کسریٰ فلما قراہ مزقہ فحسبت ان ابن المسیب قال فدعا علیھم رسول اللہ علیہ وسلم ان یمزقوا کل ممزق۔

□... عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نامہ لکھ کر ایک شخص کے حوالے کیا۔ اس کو حکم دیا کہ وہ اس کو بحرین کے گورنر کے حوالے کرے۔ بحرین کے گورنر نے اس کو کسریٰ کے پاس پہنچایا۔ کسریٰ نے جب اس کو پڑھا تو چاک کر دیا۔ میرا گمان یہ ہے کہ ابن مسیب نے یہ کہی کہ اس کے بعد رسول اللہؐ نے بددعا دی کہ یہ لوگ بھی اسی طرح پارہ پارہ کر دیئے جائیں۔

<u>وضاحت:</u>

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بحرین پر ایرانیوں کا اقتدار تھا اور وہاں کا گورنر شاہ ایران کسریٰ کا نمائندہ تھا۔ آنحضرتؐ نے اس کو ذریعہ بنایا کہ وہ آسانی سے خط کسریٰ تک پہنچا دے گا۔

یہ واقعہ ایک حقیقت ہے کہ آنحضرتؐ نے بادشاہوں کو نامے ارسال کئے تھے۔ ان بادشاہوں میں ایران کا بادشاہ کسریٰ بھی شامل تھا۔ یہ بات بھی مشہور ہے کہ اس نے آنحضرتؐ کا نامہ مبارک پھاڑ دیا۔ اسی واقعہ کا ذکر اس روایت میں ہے لیکن اس میں بددعا کا ذکر نہیں۔ روایت کا آخری حصہ تحقیق طلب

ہے کہ یہ کس کا قول ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ابن عباس کا قول نہیں ہے۔ میرے نزدیک یہ قول ابن شہاب کا ہے جو اس طرح کے ادراج کے ماہر ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ حسبت (میرا گمان یہ ہے) یہ لفظ کوئی مضبوط لفظ نہیں بلکہ ظنّیت سے بھی کمزور ہے۔ ہو سکتا ہے کہ حضورؐ نے یوں فرمایا ہو کہ یہ لوگ بھی اسی طرح پارہ پارہ ہو جائیں گے جس طرح انہوں نے میرا نامہ چاک کیا۔ اس طرح یہ جملہ خبریہ ہو سکتا ہے اور یہی اقرب ہے۔ اس لئے کہ آنحضرت اس طرح کی باتوں پر بددعا نہیں فرمایا کرتے تھے۔ آپؐ کا طریقہ یہ نہیں تھا۔ عبارت سے واضح ہے کہ راوی کو بھی اس بارے میں پورا یقین نہیں۔

امام صاحب یہ روایت مناولہ کے تحت لاتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ اس مقصد کے لئے بالکل بے معنی ہے۔ مناولہ تو یہ ہے کہ مجھے مکتوب کے ذریعے ایک روایت پہنچی ہے تو پھر مجھے اس کی روایت کا اختیار حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن اس واقعہ میں یہ مفہوم نہیں پایا جاتا۔ دوسرا شخص جو بیچ میں ہے وہ کافر ہے اور خود اس نے وہ پیغام قبول بھی نہیں کیا جو مکتوب کے ذریعے بھیجا جا رہا ہے۔ لہٰذا اس واقعہ کو محدثین کی مناولہ کی اصطلاح سے کوئی تعلق نہیں۔

۶۵۔ حدثنا محمد بن مقاتل ابوالحسن قال ثنا عبداللہ قال اخبرنا شعبۃ عن قتادۃ عن انس بن مالک قال کتب النبی صلی اللہ علیہ وسلم کتابا اوارادان یکتب فقیل لہ انھم لایقرون کتابا الا مختوما فاتخذ خاتما من فضۃ نقشہ محمد رسول اللہ کانی انظر الی بیاضہ فی یدہ فقلت لقتادۃ من قال نقشہ محمد رسول اللہ قال انسؓ۔

□... انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نامہ لکھایا لکھنے کا ارادہ کیا تو آنحضرتؐ سے کہا گیا کہ یہ لوگ ایسے خط پر اعتماد نہیں کرتے جس پر مہر نہ لگی ہو۔ اس پر آپؐ نے چاندی کی ایک انگوٹھی بنوائی جس کے اوپر "محمد رسول اللہ" کا نقش کندہ کیا گیا تھا۔ اس وقت بھی میں گویا حضورؐ کے ہاتھوں میں اس کی چمک دیکھ رہا ہوں۔ راوی کہتے ہیں کہ میں نے قتادہ سے پوچھا کہ آپ کو کس نے بتایا کہ اس پر محمد رسول اللہؐ کا نقش تھا تو انہوں نے کہا کہ انسؓ نے۔

<u>وضاحت:</u>

یہ روایت اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہے۔ میرے نزدیک مناولہ میں طریقہ قابل اعتماد ہونا چاہیئے جو شبہ سے بالاتر ہو ورنہ بیچ میں خلل پیدا ہو سکتا ہے۔ کوئی دوسرا شخص مضمون میں تھوڑی سی تبدیلی بھی کر دے تو بات کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے۔ آنحضرتؐ کے عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے اس بات کا اہتمام فرمایا کہ تمام سرکاری خطوط کے لئے مہر تیار کروائی اور تحریر کے خاتمہ پر یہ مہر لگا دی جاتی تھی۔

باب ۵۰۔ من قعد حیث ینتھی بہ المجلس ومن رای فرجۃ فی الحلقۃ فجلس فیہا۔

□... اس شخص کے بارے میں جو مجلس کا قصد کرے تو جہاں جگہ ملے وہیں بیٹھ جائے اور جو کوئی حلقے کے اندر گنجائش پائے تو وہاں بیٹھ جائے۔

وضاحت :

امام صاحب یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اگر درس حدیث کا حلقہ ہو تو اس مجلس میں آنے والوں کا کیا طریقہ ہونا چاہیے۔ یہ کوئی خاص نکتہ نہیں۔ لوگ مجالس میں آکر جہاں جگہ ملتی ہے بیٹھ ہی جاتے ہیں۔ البتہ آگے جو حدیث آرہی ہے وہ نہایت قیمتی ہے۔

۶۶۔ حدثنا اسمعیل قال حدثنی مالک عن اسحاق بن عبداللہ بن ابی طلحۃ ان ابامرۃ مولی عقیل بن ابی طالب اخبرہ عن ابی واقد اللیثی ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بینما ھم جالس فی المسجد والناس معہ اذا اقبل ثلاثۃ نفر فاقبل اثنان الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وذھب واحد قال فوقفا علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاما احدھما فرای فرجۃ فی الحلقۃ فجلس فیھا واما الآخر فجلس خلفھم واما الثالث فادبر ذاھبا فلما فرغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال الا اخبرکم عن النفر الثلثۃ اما احدھم فاوی الی اللہ فاواہ اللہ واما الآخر فاستحیی فاستحیی اللہ منہ واما الآخر فاعرض فاعرض اللہ عنہ۔

□... ابوواقد لیثی سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی میں تشریف فرما تھے اور لوگ آپؐ کے اردگرد بیٹھے تھے کہ تین آدمی نمودار ہوئے۔ دو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بڑھے لیکن ایک چل دیا۔ کہتے ہیں کہ پہلے دونوں حضرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے رکے۔ پھر ایک نے حلقے کے اندر کچھ گنجائش پائی تو وہاں جا کر بیٹھ گیا۔ دوسرے نے جگہ نہ پائی تو وہ لوگوں کے پیچھے بیٹھ گیا اور تیسرا واپس چلا گیا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فارغ ہوئے تو آپؐ نے فرمایا کہ میں ان اصحاب کی عاقبت بیان کروں۔ ایک نے اللہ کی طرف پناہ لی تو اللہ نے اس کو پناہ دی۔ دوسرا خدا سے شرمایا تو اللہ بھی اس سے شرمایا۔ رہا تیسرا تو اس نے اللہ سے اعراض کیا تو اللہ نے بھی اس سے اعراض کیا۔

وضاحت :

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کسی ایسی مجلس میں جو قرآن اور حدیث کے علم کے لئے منعقد ہو، جا کر آدمی اگر یہ رویہ اختیار کرے کہ یہاں جگہ تنگ ہے جوتوں میں، کون بیٹھے، واپس چلتے ہیں تو یہ بے نیازی اعراض کی دلیل ہے۔ اگر پیچھے ہی جگہ مل جائے تو وہیں بیٹھ جانا چاہیے اور اگر اندر جگہ مل جائے تو فبہا۔ اس بات کو آنحضرتؐ نے یوں تعبیر فرمایا کہ ایک نے اللہ کی طرف پناہ لی تو اللہ نے اس کو پناہ دے دی یعنی جہاں اس کو گنجائش مل گئی بیٹھ گیا اور اس کے بیٹھنے کو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمالیا۔ دوسرے نے کہا کہ آگے جگہ نہیں ملتی، پائیں میں ملتی ہے وہیں بیٹھ جاتے ہیں۔ اب رسول اللہؐ کی مجلس کو چھوڑ کر جائیں تو یہ بڑی محرومی ہوگی۔ ایسے شخص کے رویہ پر اللہ تعالیٰ نے بھی شرم رکھی کہ اس بندے کو اس کی نیت کا اچھا پھل دیا اور اس کو قبول فرمالیا۔ تیسرے آدمی نے مجلس سے اعراض کیا تو اللہ تعالیٰ نے بھی اس کو رد کر دیا۔ اس طرح کی بات آنحضرتؐ ہی کہہ سکتے تھے۔ ہم شما اس پوزیشن میں نہیں ہوتے کہ کسی شخص پر کوئی حکم لگا سکیں۔ مثلاً ہو سکتا ہے ایک شخص کسی شدید ضرورت کے تحت مجلس سے واپس گیا ہو۔ ہم اس کے بارے میں یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ وہ معرض ہے۔ تاہم اس روایت سے یہ بات ضرور نکلتی ہے کہ قرآن و حدیث کی مجلس سے اعراض نہیں کرنا چاہیے۔ جس طریقے سے بھی ممکن ہو وہاں گنجائش پیدا کرنی چاہیے۔ اگر اندر جگہ نہ ملے تو آدمی پائیں میں ہی بیٹھ جائے۔ اس کی یہ خاکساری اور تواضع اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت مقبول ہوگی۔ اس لئے کہ اس نے اللہ تعالیٰ سے شرم کی اور پائیں میں ہی بیٹھنا گوارا کر لیا۔ اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائے گا۔

یہ حدیث بہت اعلیٰ درجے کی ہے۔ مجلسی آداب کے بارے میں بھی اس کی اہمیت واضح ہے۔ دینی مجالس کے علاوہ دوسری مجالس کے آداب میں بھی یہ بات ہے کہ جہاں کہیں جگہ ملے آدمی وہیں بیٹھ جائے اور صدر جگہ کی طرف اقدام نہ کرے۔ اگر وہ دیر سے آیا ہے تو اپنا قصور تسلیم کرے۔ مساجد میں بھی یہ خیال ہونا چاہیے کہ آدمی اگر دیر سے آئے تو صفوں کو پھلانگتا ہوا آگے جانے کی کوشش نہ کرے بلکہ جہاں جگہ میسر ہو وہیں بیٹھ جائے۔

روایت کی جامعیت کے مقابلہ میں امام بخاریؒ نے جو باب باندھا ہے وہ ناتمام ہے۔

باب ۵۱۔ قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم رب مبلغ اوعی من سامع

□... نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد کہ اکثر اشخاص براہ راست سننے والوں سے زیادہ یاد رکھنے والے ہوتے ہیں۔

۶۷۔ حدثنا مسدد قال حدثنا بشر قال حدثنا ابن عون عن ابن سیرین عن عبدالرحمن

بن ابی بکرة عن ابیه ذکر النبی صلی الله علیه وسلم قعد علی بعیره وامسک انسان بخطامه او بزمامه قال ای یوم هذا فسکتنا حتی ظننا انه سیسمیه بغیر اسمه قال الیس یوم النحر قلنا بلی، قال فای شهر هذا فسکتنا حتی ظننا انه سیسمیه بغیر اسمه قال الیس بذی الحجة قلنا بلی، قال فان دماء کم و اموالکم و اعراضکم بینکم حرام کحرمة یومکم هذا فی شهر کم هذا فی بلد کم هذا لیبلغ الشاهد الغائب فان الشاهد عسی ان یبلغ من هو اوعی له منه۔

... عبدالرحمن بن ابی بکرہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں۔ انہوں نے ذکر کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اونٹ پر سوار تھے اور ایک آدمی اونٹ کی نکیل یا باگ پکڑے ہوئے تھا۔ آپ نے پوچھا جانتے ہو کہ آج کا دن کونسا دن ہے تو ہم سب خاموش رہے۔ ہم نے گمان کیا کہ آج آپ اس کو کسی اور نام سے تعبیر کریں گے۔ آپ نے فرمایا کہ کیا آج یوم نحر (قربانی کا دن) نہیں؟ ہم نے عرض کی۔ جی، وہی ہے۔ پھر آپ نے پوچھا یہ کون سا مہینہ ہے۔ ہم خاموش رہے۔ ہمیں خیال ہوا کہ آپ اس کو کسی اور نام سے تعبیر کریں گے۔ آپ نے فرمایا کہ کیا یہ ذی الحجہ کا مہینہ نہیں؟ ہم نے کہا جی، وہی ہے۔ پھر آپؐ نے فرمایا یاد رکھو کہ تمہارے خون، تمہارے مال، تمہاری آبروئیں، تمہارے لیے اسی طرح محترم ہیں جس طرح آج کا دن محترم ہے، یہ مہینہ محترم ہے اور یہ شہر محترم ہے۔ جو لوگ یہاں موجود ہیں وہ ان کو میرا پیغام پہنچا دیں جو موجود نہیں۔ کیونکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ حاضر ہونے والے کسی بات کو ان لوگوں تک پہنچا دیتے ہیں جو ان سے زیادہ سننے سمجھنے والے ہوتے ہیں۔

وضاحت :

اس حدیث کے ایک ٹکڑے سے امام بخاریؒ نے باب باندھ دیا ہے۔ یہ ٹکڑا واقعی حدیث کی جان ہے۔ ایک کلمہ حق جو کسی کے کان میں پڑے اس کو دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اصل سامع کے علاوہ بھی ایسے قابل جوہر ہوتے ہیں جن کو بات پہنچ جائے تو وہ قطرے کو دریا بنالیں اور محفوظ کرلیں گے۔ اگر کسی تک براہ راست بات پہنچی ہے تو اس کو یہ شرف تو ضرور حاصل ہو چکا کہ وہ پہلا سننے والا ہے لیکن اس کو یہ گمان بھی رکھنا چاہیے کہ اگر میرے طریقے سے یہ بات دوسروں کو پہنچ جائے گی تو ان میں سے کوئی ایسا شخص بھی ہو سکتا ہے جو اس بات کی قدر و قیمت کو اس نے جو ہر کو مجھ سے زیادہ سمجھ سکے اور اس سے صحیح فائدہ اٹھائے۔

یہ روایت حجۃ الوداع کے خطبے کی ہے جس کا ایک ٹکڑا یہاں نقل کیا گیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس خطبہ میں جو زور خطابت ہے وہ خطابت سے آشنا لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اگر دنیا میں بہترین، جامع ترین اور مکمل ترین خطبے کی کوئی مثال دی جائے تو وہ یہ خطبہ ہے۔ خطابت کے اعتبار سے بھی اور اپنے

معارف اور علوم کے اعتبار سے بھی اس سے بڑا آسمان کے نیچے اور کوئی خطبہ نہیں۔

یہ سب کو معلوم تھا کہ ذی الحجہ کا مہینہ محترم ہے۔ اشہر حرم کا احترام تو جاہلیت کے زمانے سے چلا آرہا تھا۔ ان مہینوں کے احترام میں سب اپنی تلواریں میان میں کر لیتے تھے۔ اسی طرح قربانی کے دن اور مکہ مکرمہ کی عظمت سے بھی لوگ آگاہ تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال کرکے لوگوں کو گویا جگادیا کہ کان کھول کر سن لو کہ آج کا دن مبارک دن ہے۔ یہ قربانی کا دن ہے اور آج کا مہینہ اور یہ شہر جس میں مسجد حرام ہے سب محترم ہیں۔ تمہارے جان و مال اور عزت و آبرو کی حرمت بھی اس دن، مہینہ اور شہر کی حرمت کی مانند ہے۔ پھر فرمایا کہ جو لوگ آج یہاں موجود ہیں وہ ان لوگوں کو میرا پیغام پہنچا دیں جو موجود نہیں ہیں۔ یہ ابلاغ کی ذمہ داری آپ نے سننے والوں پر اس لیے ڈالی کہ حاضر لوگ بسا اوقات کسی بات کو ان لوگوں تک پہنچا دیتے ہیں جو ان سے زیادہ عاقل، عالم، فقیہ اور حکیم ہوتے ہیں۔ لہٰذا وہ بات ان کو زیادہ نفع پہنچاتی ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا اطلاق روایت حدیث پر بھی ہوتا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ حدیث کے بہت بڑے راوی ہیں لیکن متعدد ایسی مثالیں موجود ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان پر اعتراض کیا کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کو نہیں سمجھے۔ راویان حدیث میں فقیہ اور غیر فقیہ راوی کی تقسیم اس لیے کی گئی ہے کہ ہر راوی کا مقام ایک جیسا نہیں ہے۔ انہوں نے سامع کی حیثیت سے ابلاغ کی ذمہ داری ادا کردی لیکن ان کی روایت سے صحیح استفادہ علمائے ربانی نے کیا۔ امام مالک تک جو روایات پہنچیں انہوں نے ان کو موطا میں جمع کرکے اپنی فقہ کی بنیاد رکھ دی۔ اسی طرح امام بخاریؒ نے روایات کا ایک عمدہ ذخیرہ مرتب کرکے امت کے ہاتھوں میں دے دیا۔

باب ۵۲۔ العلم قبل القول والعمل لقول الله عز وجل فاعلم انه لا اله الا الله فبدا بالعلم وان العلماء هم ورثة الانبياء ورثوا العلم من اخذه اخذ بحظ وافر ومن سلک طريقا يطلب به علما سهل الله له طريقا الى الجنة وقال انما يخشى الله من عباده العلماء وقال وما يعقلها الا العالمون قال قالوا لو كنا نسمع او نعقل ما كنا في اصحاب السعير وقال هل يستوي الذين يعلمون والذين لا يعلمون وقال النبي صلى الله عليه وسلم من يرد الله به خيرا يفقهه في الدين وانما العلم بالتعلم وقال ابوذر لو وضعتم الصمصامة على هذه واشار الى قفاه ثم ظننت اني انفذ كلمة سمعتها من النبي صلى الله عليه وسلم قبل ان تجيزوا على لانفذتها وقول النبي صلى الله عليه وسلم ليبلغ الشاهد الغائب وقال ابن عباس كونوا ربانيين حلماء وعلماء وفقهاء ويقال الرباني الذي يربي الناس بصغار العلم قبل كباره۔

■ ... کہنے اور عمل کرنے سے پہلے علم ضروری ہے کیونکہ اللہ تعالے کا ارشاد ہے فاعلم انہ لا الہ الا اللہ (محمد ۱۹) جان لو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس آیت کا آغاز علم سے کیا ہے۔ نیز علماء ہی کا یہ مقام ہے کہ وہ انبیاء کے وارث ہیں۔ ان کو پیغمبروں کے علم کی وراثت ملی۔ اس میں سے جس نے علم حاصل کیا اس نے وافر حصہ حاصل کیا اور جو کوئی علم حاصل کرنے کے لیے راستہ چلے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کا راستہ آسان کر دے گا۔

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے انما یخشی اللہ من عبادہ العلموا (فاطر ۲۸) در حقیقت اللہ تعالیٰ سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو عالم ہوتے ہیں۔ نیز فرمایا وما یعقلھا الا العالمون (عنکبوت ۴۳) یہ باتیں وہی سمجھتے ہیں جو عالم ہیں۔ پھر ارشاد ہے قالوا لو کنا نسمع او نعقل ما کنا فی اصحاب السعیر (ملک ۱۰) اگر ہم سنتے اور سمجھتے تو ہم جہنم والوں میں نہ بنتے۔ نیز فرمایا ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون (زمر ۹) کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہیں۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کے لیے بھلائی چاہتا ہے اس کو دین کی سمجھ دے دیتا ہے اور یہ کہ علم سیکھنے سے ہی آتا ہے۔ ابوذرؓ کا قول ہے کہ اگر تم تلوار یہاں رکھ دو (اور اشارہ اپنی گردن کی طرف کیا) پھر میں یہ گمان کروں کہ میں ایک کلمہ جو میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہو وہ لوگوں کو منتقل کر سکوں گا تو اپنی گردن مارے جانے سے پہلے ضرور کر دوں گا۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حاضر کو چاہیے کہ میری بات غائب کو پہنچا دے۔ اور ابن عباسؓ نے کہا کہ تم ربانی بن جاؤ یعنی حلیم، عالم اور سمجھدار۔ بعضوں نے کہا کہ ربانی وہ ہوتا ہے جو لوگوں کو علم کی بڑی بڑی باتیں سکھانے سے پہلے چھوٹی چھوٹی باتیں سکھا کر ان کی تربیت کرے۔

وضاحت:

یہ باب کا عنوان ہے۔ اس میں قرآن مجید کی آیات بھی ہیں، حدیثیں بھی ہیں اور صحابہ کے اقوال بھی، لیکن امام صاحب نے اس باب کے تحت کوئی روایت نقل نہیں کی۔ عنوان میں جو روایات نقل کی ہیں ان کی نوعیت تعلیق یا صرف ایک حوالے کی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا امام صاحب کو اتنی ساری باتیں ثابت کرنے کے لیے اپنے معیار پر کوئی روایت نہیں ملی؟ یہ بات نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ مضامین ایسے ہیں کہ ان کے بارے میں مضبوط روایات موجود ہیں۔ ایک توجیہہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس موضوع کی روایات انہوں نے عنوان کے اندر ہی نقل کر دی ہیں اور اسی کو انہوں نے کافی خیال کیا ہے۔ مزید کی ضرورت نہیں محسوس کی۔ یہ توجیہہ بھی صحیح نہیں کیونکہ متعدد ابواب میں انہوں نے روایات کی طرف اشارہ کیا ہے لیکن اس کے باوجود آگے پوری روایت نقل بھی کی ہے۔ میرے نزدیک عنوان

کے اندر ذکر کر کے امام صاحب نے اشارہ کیا ہے کہ اس باب میں وہ اس قسم کی روایات لائیں گے لیکن ان کو روایات جمع کرنے کی فرصت نہ ملی اور کتاب کی روایت شروع ہو گئی۔ بڑے لوگوں کے ہاں ایسا ہو جاتا ہے۔

امام صاحب کا یہ فرمانا کہ کہنے اور عمل کرنے سے پہلے علم ضروری ہے نہایت ہی قیمتی بات ہے۔ اس زمانے میں مقتدا اور امام بننے کے لیے کچھ جاننے کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ لیکن دین میں یہ ہے کہ پہلے جانو پھر کچھ کہو۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے یہود کے پیشواؤں کو "اندھے راہ دکھانے والے" کہا۔ مطلب یہ کہ خود کو کچھ نظر نہیں آتا لیکن دوسروں کو راستہ دکھانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ ایک مشہور قول ہے کہ طبیب پہلے تو اپنا علاج کر۔ اس کا مفہوم بھی یہی ہے۔ ایک ایسا طبیب جسے آتا جاتا کچھ نہ ہو اور وہ نسخہ لکھنے بیٹھ جائے تو وہ لوگوں کے لیے ہلاکت ہی کا باعث بنے گا۔ ہمارے بعض مذہبی لیڈر بھی کہتے ہیں کہ خلق کی خدمت کرنی چاہیے، پڑھنے میں کون وقت ضائع کرے۔ اس باب میں امام بخاریؒ ایسے لیڈروں کی فکری غلطی کی نشاندہی کر رہے ہیں۔ وہ اس کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جب سب سے بڑی حقیقت بیان کی تو فرمایا یہ بات جان لو کہ نہیں ہے کوئی معبود مگر اللہ تعالیٰ۔ یعنی اس حقیقت کے بیان کا آغاز لفظ اعلم (جان لو) سے کیا ہے۔

پھر امام صاحب نے ایک روایت کا حوالہ دیا ہے کہ علماء ہی انبیاء کے وارث ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ علم رکھنے والوں ہی کو انبیاء کی وراثت منتقل ہو گی۔ یہ نہیں کہ خطیبوں، قلم بازوں اور لیڈروں کو منتقل ہو جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ دین کے علماء ہی نے یہ وراثت پائی ہے۔ اور جس نے اس وراثت کو پایا وہ بڑا خوش قسمت ہے۔ اس نے نیکی کا بہت بڑا حصہ پایا۔ بڑی سے بڑی جائداد کے مقابل میں علم کی وراثت افضل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی بڑی سے بڑی بادشاہی بھی اس کے مقابل میں کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتی، اگرچہ اہل دنیا کی نگاہوں میں اس علم کی ٹکے کی قیمت نہیں۔

پھر امام صاحب نے ایک اور روایت کا حوالہ دیا ہے کہ جو شخص علم کے راستے میں جدوجہد کرے گا اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کے راستے کو آسان کر دے گا یعنی جنت کا راستہ علم ہی سے کھلتا ہے۔ ظاہر ہے کہ علم ہو گا تو آدمی کا عقیدہ و عمل درست ہو گا اور عقیدہ و عمل کی درستی ہی پر جنت کی راہ کھلتی ہے۔ لہٰذا علم کے لیے جدوجہد کرنے والا اپنے لیے جنت کی راہ ہموار کرتا ہے۔

اس کے بعد امام صاحب نے آیات نقل کی ہیں جو ان کے نزدیک ان کے دعوی پر دلیل ہیں۔ سورۃ فاطر کی آیت کا مفہوم ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں اس کے وہ بندے جو عالم ہوتے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ جتنا کسی کے اندر صحیح علم ہو گا اتنی ہی اس کے اندر اللہ کی خشیت ہو گی اور خشیت سے عاری شخص محض ایک جانور ہے چاہے دنیا کی نگاہوں میں کتنا ہی معزز ہو۔

سورۂ ملک کی آیت میں جہنم واصل ہونے والوں کا یہ قول نقل ہوا ہے کہ اگر ہم سننے والے اور سمجھنے والے ہوتے تو ہم جہنم میں نہ جاتے۔ مطلب یہ کہ آخرت کی کامیابی کے لیے سننا اور سمجھنا ضروری ہے۔ یعنی علم حاصل کر کے اس پر عمل کرنا ہی آخرت کی فلاح کا ضامن ہے۔

سورۂ زمر سے نقل کردہ آیت کی رو سے جاننے والے اور نہ جاننے والے دونوں یکساں نہیں ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ عالم باعمل ہی کامیاب ہوں گے۔ یہ تمام آیات علم کی فضیلت کے حق میں دلیل ہیں اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ عمل پر علم مقدم ہے۔

اس کے بعد امام صاحب نے تحصیل علم کے حق میں روایت نقل کی ہے اور پھر صحابہ کرامؓ کے اقوال درج کیے ہیں۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کا قول نقل کیا ہے کہ اگر میری گردن پر تلوار رکھی ہوئی ہو اور مجھے گردن اڑائے جانے سے پہلے اس بات کا موقع مل جائے کہ میں کوئی ایک بات جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے سنی ہو کسی دوسرے تک منتقل کر دوں تو میں ضرور کر دوں گا۔

امام صاحب نے ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ ربانی بنو اور ربانی ہونے کا مطلب ہے حلیم (بردبار)، عالم اور فقیہہ۔ گویا دین کا فہم اور دین کی بصیرت رکھنے والے بنو۔

امام صاحب کے بقول بعض نے ربانی سے وہ عالم مراد لیے ہیں جو بڑے بڑے مسائل سے پہلے لوگوں کو چھوٹی چھوٹی اور سہل باتیں سکھا کر ان کی تربیت کرتے ہیں۔ ربانی کی یہ تعریف کسی غیر معروف شخص کی خود ساختہ ہے۔ ربانی کے معنی علماء کے ہیں اور یہ لفظ اہل کتاب سے آیا ہے۔ اس لیے حضرت ابن عباسؓ کی بیان کردہ تفصیل صحیح ہے۔

اس بات کا تعلق کہ پہلے چھوٹی چھوٹی باتیں بتائی جائیں تاکہ سننے والا ان سے مانوس ہو جائے، بعد میں بڑی بڑی باتیں بتائی جائیں، آداب تعلیم سے ہے۔

باب ۵۳۔ ما کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یتخولھم بالموعظۃ والعلم کی لا ینفروا۔

■ ... نبی صلی اللہ علیہ وسلم موقع اور وقت کا لحاظ کر کے صحابہ کو نصیحت کرتے اور علم سکھاتے تاکہ وہ بیزار نہ ہوں۔

۶۸۔ حدثنا محمد بن یوسف قال انا سفیان عن الاعمش عن ابی وائل عن ابن مسعود قال کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یتخولنا بالموعظۃ فی الایام کراھۃ السآمۃ علینا۔

■ ... ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کا اہتمام رکھتے تھے کہ نصیحت کرنے اور علم سکھانے کے مواقع ایسے ہوں کہ لوگ بے زار نہ ہوں۔

(بقیہ صفحہ ۵ پر)

تدبرِ حدیث
امین احسن اصلاحی

زمینوں کے متعلق فیصلے

(موطا امام مالک کی کتاب الاقضیہ کی روایات)

القضاء فی امہات الاولاد

(ماں بننے والی لونڈیوں کے بارے میں فیصلہ)

قال یحیی قال مالک عن ابن شہاب عن سالم بن عبداللہ بن عمر عن ابیہ ان عمر بن الخطابؓ قال ما بال رجال یطئون ولائدھم ثم یعزلوھن لا تاتینی ولیدۃ یعترف سیدھا ان قد الم بھا الا الحقت بہ ولدھا فاعزلوا بعد ذالک او اترکوا۔

■ ... حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے کہا کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اپنی لونڈیوں سے تعلقات زن و شو قائم کرتے ہیں پھر ان کو چھوڑ دیتے ہیں تو کوئی لونڈی اگر ایسی میرے پاس آئے گی جس سے اس کے آقا نے ملاقات کا اعتراف کیا ہو گا تو اس سے جو اولاد ہو گی میں اس کو اسی آقا کے کھاتے میں ڈال دوں گا۔ چاہے چھوڑ دیا جوڑو۔

<u>وضاحت :</u>

حضرت عمرؓ نے یہ فیصلہ کیا کہ جس مالک نے ملاقات کی ہے بچہ اسی کا ہے۔ چاہے بعد میں لونڈی کو چھوڑ دے چاہے رکھے رہے۔ اس میں حضرت عمرؓ مالک کو یہ رعایت دے رہے ہیں کہ وہ اگر وطی کا اعتراف کرے تب ایسا کیا جائے گا ورنہ نہیں۔ اس زمانہ میں غلامی کا یہ مسئلہ سرے سے موجود ہی نہیں رہا اس لئے اس میں زیادہ پڑنے کی ضرورت نہیں۔

القضاء فی عمارۃ الموات

(مردہ زمینوں کو آباد کرنے کے بارے میں فیصلہ)

حدثنی یحیٰی عن مالک عن ہشام بن عروۃ عن ابیہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: من احیا ارضاً میتۃ فھی لہ ولیس لعرق ظالم حق۔ قال مالک والعرق الظالم کل ما احتفر او اخذ او غرس بغیر حق۔

▪... ہشام بن عروہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے کسی مردہ زمین کو زندہ کیا وہ اس کی ہے اور کسی ناجائز تصرف کرنے والے کا حق نہیں۔ امام مالک کہتے ہیں کہ ناجائز تصرف کرنے والا ہر وہ شخص ہے جو بغیر کسی حق کے اس میں کنواں کھودے یا قبضہ کرے یا درخت لگائے۔

وحدثنی مالک عن ابن شہاب عن سالم بن عبد اللہ عن ابیہ ان عمر بن الخطاب قال: من احیا ارضاً میتۃ فھی لہ قال مالک وعلی ذالک الامر عندنا۔

▪... سالم بن عبداللہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب ؓ نے فرمایا کہ جس نے مردہ زمین کو زندہ کیا وہ اس کی ہے۔ امام مالک کہتے ہیں کہ ہمارا فتویٰ یہی ہے۔

وضاحت :

یہ روایات غیر آباد افتادہ زمین کو آباد کرنے کا طریقہ بتاتی ہیں۔ اس زمانہ میں زمین یا تو حکومت کی ملکیت ہے یا لوگوں کی۔ ظاہر ہے کہ کسی دوسرے کی زمین اس کی اجازت کے بغیر تو آباد نہیں کی جا سکتی۔ وہی زمین آباد کی جا سکتی ہے جو کسی کی ملکیت نہ ہو یا مالک اس کی اجازت دیتے دے کہ آباد کرنے والا آباد کرنے پر اس کی ملکیت کے حقوق حاصل کرے گا۔ آج کل حکومت جو زمین دیتی ہے وہ عام طور پر اس شرط کے تحت دیتی ہے کہ دو یا تین سال میں آباد کر لی جائے ورنہ حکومت کو حق ہو گا کہ زمین واپس اپنے قبضے میں لے لے اور کسی دوسرے شخص کو موقع دے کہ وہ مقررہ مدت میں آباد کرے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کا مطلب یہ ہے کہ جو کوئی افتادہ مردہ زمین کو آباد کرے گا تو وہ اسی کی ملکیت ہو گی اور کسی دوسرے کو یہ حق نہیں ہو گا کہ وہ اس میں کسی قسم کی مداخلت کرے۔ اسی پر حضرت عمر ؓ کا

عمل بیان کیا گیا ہے اور مالکیہ کا فتویٰ بھی یہی ہے۔ میرے نزدیک یہ بات نہایت معقول ہے کہ افتادہ زمینیں پڑی نہیں رہنی چاہئیں۔ ان کو آباد کرنا چاہیئے۔ خواہ وہ زمین حکومت کی ملکیت ہو یا کسی دوسرے کی۔

زمین کے اوپر جب اللہ کے بندے آنے لگے تو کھیتی باڑی کا کام شروع ہوا۔ آغاز میں تو یہ ہوا کہ جتنا رقبہ کسی نے آباد کر لیا وہ اس کا ہو گیا۔ اس کے مرنے پر یہ رقبہ اس کی آل اولاد کو منتقل ہوا۔ جوں جوں دنیا کی آبادی میں اضافہ ہوا، مزید رقبہ زیر کاشت آ گیا۔ یہاں تک کہ اب زمین لوگوں کی قانونی ملکیت ہے یا بعض قطعات حکومت کی ملکیت ہیں۔ کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ دوسرے کی زمین کو اپنے تصرف میں لے آئے یا اس میں کنواں کھودے یا اس پر قبضہ کرے۔ البتہ اگر رقبے افتادہ پڑے ہوں اور مالکوں کو ان کے آباد کرنے کی فکر نہ ہو تو حکومت یہ حکم دے سکتی ہے کہ لوگ ان کو معین مدت میں آباد کریں۔ ورنہ حکومت کو حق ہو گا کہ وہ ان کو اپنے قبضہ میں لے کر ان کو آباد کرنے کا انتظام کرے۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ بعض زمینیں اس لئے غیر آباد پڑی ہوتی ہیں کہ ان کی سیرابی کے لئے پانی میسر نہیں۔ جیسے ہی پانی کا بندوبست ہو جائے گا زمین آباد ہو جائے گی۔ آجکل زمین نے سرمائے کی حیثیت اختیار کر لی ہے اور اب افتادہ زمین بہت کم ہے۔ صرف ایسے علاقوں میں ہے جہاں پانی دستیاب نہیں اور بارش بھی نہیں ہوتی۔ خاص کر صحرائی علاقے غیر آباد ہیں جہاں زمین آباد کرنا ممکن نہیں۔

القضاء فی المیاہ

(پانی کے بارے میں فیصلے)

حدثنی یحیٰی عن مالک عن عبد اللہ بن ابی بکر بن محمد بن عمرو بن حزم انہ بلغہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال فی سیل مھزور ومذینب یمسک حتی الکعبین ثم یرسل الاعلی علی الاسفل۔

▪... عمرو بن حزم سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کو یہ بات پہنچی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مھزور اور مذینب کے سیلاب کا پانی اوپر کی زمینوں والے ٹخنوں تک روک کر باقی کو نیچے والوں کے لئے چھوڑ دیا کریں۔

وضاحت :

مھزور اور مذینب مدینہ کے نزدیک دو وادیاں تھیں۔ ان کے سیلاب کا پانی لوگوں کے باغات کو

سیراب کرتا۔ لیکن جیسا پانی کی قلت کے علاقوں میں ہوتا ہے بارشوں میں لوگ کدال اور پھاوڑے لے کر زمینوں پر پہنچ جاتے اور حریفوں کا پانی کاٹ کر اپنے رقبوں میں زیادہ پانی روکنے کی کوشش کرتے۔ اس طرح بارش کا یہ پانی جھگڑے کا باعث بنتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا فیصلہ یوں فرمایا کہ جو لوگ وادی کے اوپر کے حصے میں ہیں وہ ٹخنوں کی بلندی سے زیادہ پانی نہ روکیں اور اس سے زائد پانی کو نیچے والوں کے لئے چھوڑ دیں۔ ٹخنوں تک اونچا پانی زمین کی سیرابی کے لئے کافی ہوتا ہے اور اس سے زیادہ پانی روکنے میں دوسروں کی حق تلفی ہے۔ آجکل بھی نہروں، بندوں اور ڈیموں کے پانی کے استعمال کے قاعدے ہیں۔ ایک خاص مقدار تک پانی نہروں میں چھوڑا جاتا ہے اور بقیہ کو ملک کے زیریں حصہ کی آبپاشی کے لئے دریا میں بہنے دیا جاتا ہے۔

حدثنی مالک عن ابی الزناد عن الاعرج عن ابی ھریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: لایمنع فضل الماء لیمنع بہ الکلاء۔

▪... حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فالتو پانی اپنے چارے اور چراگاہ کی حفاظت کے لئے نہیں روکا جائے گا۔

<u>وضاحت :</u>

ایک تو پبلک کنواں ہوتا ہے جس کا پانی ہر ایک لے سکتا ہے۔ اس میں باری ٹھہرائی جاتی ہے۔ یہ روایت اس کے متعلق نہیں بلکہ ذاتی کنویں سے متعلق ہے۔ اس میں مالک کا حق مقدم ہوگا۔ ں کے بعد جو فالتو پانی ہوگا اس کو روکنے کا حق مالک کو نہیں ہوگا۔ کنویں کے اردگرد گھاس اور چارہ مالک کا ہوتا ہے۔ اس کی حفاظت کی بناء پر بھی مالک کو فالتو پانی روکنے کا حق نہیں ہوگا۔ ایک چیز جس کو "شفط" کہتے ہیں یعنی ہونٹ تر کرنا یا پیاس بجھانا اس سے آپ نہیں روک سکتے۔ یہ ہونٹ خواہ انسانوں کے ہوں یا مویشیوں کے۔ آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ کنویں کے پاس چارے کا کھیت ہے۔ اس کو بکریاں یا اونٹ تباہ کردیں گے۔ پانی دینا واجب ہے۔ کھیت سے روکنا آپ کا حق ہے۔ لیکن آپ اپنے کھیت کو بچانے کا بندوبست کریں۔ پانی پینے سے نہیں روک سکتے۔

یہ ضروری ہے کہ ہر کنویں کی حریم ہو یعنی اس کے ساتھ کچھ زمین چھوڑ دی جائے تاکہ جانور وہاں پر بیٹھ سکیں اور پانی پی سکیں۔ اگر کنویں کے ساتھ کسی دوسرے کی زمین ہو تو اس سے بھی کنویں کی حریم بنانے کے لئے قبضہ کیا جاسکتا ہے۔ اس کی تفصیلات قاضی ابو یوسف کی کتاب میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

حدثنی مالک عن ابی الرجال محمد بن عبدالرحمن عن امہ عمرۃ بنت عبدالرحمن انہا اخبرتہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لایمنع نقع بئر۔

▪... محمد بن عبدالرحمن کی والدہ عمرہ نے ان کو خبر دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی کنویں کا نقع روکا نہیں جاسکتا۔

<u>وضاحت :</u>

یہ روایت بھی اوپر والی روایت کے ہم معنی ہے۔ پانی ایسی چیز نہیں جس سے روکا جائے۔ یہ "ماعون" میں داخل ہے۔ قرآن مجید میں آخرت سے غافل لوگوں کا کردار بیان کرتے ہوئے ان کی بخالت کی صفت بھی بتائی ہے کہ وہ ماعون یعنی استعمال کی معمولی اشیاء کو بھی لوگوں سے روکتے ہیں۔ تو کنویں کا پانی روکنے والے بھی مذکورہ کردار کے حامل ہوتے۔ چشموں کا پانی بھی اس میں شامل ہے۔ البتہ کارپوریشنوں اور میونسپل کمیٹیوں کا پانی اس میں شامل نہیں۔ ان کا پانی ملکی قوانین کے تحت ہی استعمال میں لایا جاسکتا ہے۔

القضاء فی المرفق

(فوائد کے متعلق فیصلہ)

"مرفق" ۔ وہ سہولت یا فائدہ جس میں مالک کا نقصان نہ ہو رہا ہو۔ اس کا ایک تو اخلاقی پہلو ہے کہ صرف اس بنیاد پر کہ آپ کسی چیز کے قانونی مالک ہیں دوسروں کو فائدہ نہ اٹھانے دیں۔ ایسا کرنے سے بہت سے سماجی نقصانات ہوتے ہیں۔ اس کا دوسرا پہلو شریعت کے نقطہ نظر سے ہے۔ شریعت نے حکومت کو یہ قانونی حق دیا ہے کہ اس طرح کی رکاوٹ یا ممانعت پیدا کرنے والے کو وہ روک سکتی ہے۔

حدثنی یحییٰ عن مالک عن عمرو بن یحییٰ المازنی عن ابیہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: لاضرر ولاضرار۔

■... یحییٰ مازنی اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدمی نہ خود ضرر اٹھائے اور نہ کسی کو ضرر پہنچائے۔

<u>وضاحت :</u>

یہ اسی طرح کا کلیہ ہے جیسا کہ لاضرر ولا غرر کا کلیہ ہے۔
لا ضرر ولا غرر کا مطلب یہ ہے کہ معاملے کی وہ تمام شکلیں صحیح ہیں جن میں دونوں پارٹیوں میں سے کسی ایک کو نہ نقصان پہنچے نہ اس سے دھوکہ ہو۔ لاضرر ولا ضرار کا مفہوم یہ ہے کہ معاملہ میں نہ ہم کو کسی سے نقصان پہنچے اور نہ ہم کسی کے نقصان کا سبب بنیں۔ ہمارے ہاں فریقین کے باہم معاملے میں یہ ایک بنیادی اصول ہے۔ اس کی روشنی میں کوئی ایسا معاملہ جائز نہیں جس میں فریقین میں سے ایک فریق کو نقصان پہنچ رہا ہو اور دوسرا اس نقصان کا ذمہ دار ہو لیکن نقصان میں شریک نہ ہو۔ یہ ان دس اصولوں میں سے ایک ہے جن کو فقہ کی بنیاد بتایا جاتا ہے۔ میرے نزدیک یہ جملہ دعا کا مفہوم بھی دیتا ہے اور معاملات کی بنیاد بھی فراہم کرتا ہے۔

حدثنی مالک عن ابن شهاب عن الاعرج عن ابی هريرة ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال : لا يمنع احدكم جاره خشبة يغرزها فی جداره، ثم يقول ابو هريرة مالی اراكم عنها معرضين والله لارمين بها بين اكتافكم

■... حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی بھی اپنے پڑوسی کو اس سے نہ روکے کہ وہ اس کی دیوار میں اپنی کھونٹی ٹھوک لے۔ پھر حضرت ابو ہریرہؓ نے یہ بھی فرمایا کہ کیا بات ہے کہ تم میری بات سے اعراض کرتے ہو۔ خدا کی قسم میں تمہارے آگے یہ چیز پھینکتا ہی رہوں گا۔

<u>وضاحت :</u>

مطلب یہ ہے کہ ایک پڑوسی اگر آپ کی دیوار میں کوئی کھونٹی گاڑنا چاہتا ہے تو اس کو یہ سہولت دینی چاہیے الا آنکہ آپ کو نقصان پہنچ سکتا ہو۔ بغیر کسی معقول سبب کے اسے روکنا نہیں چاہیے۔
حضرت ابو ہریرہؓ کے قول پر شارحین نے بلاوجہ تفسیر شروع کر دی ہے کہ کیا اس زمانے میں مسلمانوں کی اخلاقی حالت اتنی گر گئی تھی کہ حضرت ابو ہریرہؓ کو یہ کہنا پڑا کہ تم سنو یا نہ سنو میں تمہارے

اوپر یہ مبارک تعلیم پھینکتا ہی رہوں گا۔ حضرت ابو ہریرہؓ کے اقوال سے کسی جگہ میرے اوپر یہ اثر نہیں پڑا کہ ان کی زندگی ہی میں مسلمانوں کی عمومی حالت اتنی بگڑ چکی تھی۔ اس زمانے میں آج کل کا سفلہ پن مشکل ہی سے ملتا ہو گا لیکن اکا دکا واقعات پیش آنا کوئی بعید بات نہیں۔ انسان ہمیشہ سے انسان ہی تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ اپنے مزاج کے لحاظ سے ان معاملات میں بڑے حساس تھے۔ انہوں نے سنا ہو گا یا کسی کو دیکھا ہو گا کہ اس طرح کی خست سے کام لے رہا ہے تو انہوں نے کہہ دیا ہو گا کہ سنو یا نہ سنو، میں تو تمہارے آگے یہ تعلیم پیش کرتا ہی رہوں گا۔
ایک شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ محض اخلاقی نصیحتیں ہیں لیکن میرے نزدیک ان معاملات میں یہ کہنا کہ یہ محض ایک اخلاقی بات ہے، آپ کو اختیار ہے اس پر عمل کریں یا نہ کریں، درست نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وقت آئے جب قانون بنانے والوں کو مداخلت کرنی پڑے تو ایسی مداخلت غلط نہیں ہو گی۔ آگے والی روایت سے اس کی وضاحت ہو جائے گی۔

حدثنی مالک عن عمرو بن یحییٰ المازنی عن ابيه ان الضحاک بن خليفة ساق خليجاً له من العريض فاراد ان يمر به فی الارض محمد بن مسلمة فابیٰ محمد، فقال له الضحاک لم تمنعنی وهو لک منفعة تشرب به اولا و آخرا ولا يضرک فابیٰ محمد فكلم فيها الضحاک عمر بن الخطاب فدعا عمر بن الخطاب محمد بن مسلمة فامره ان يخلی سبيله، فقال محمد لا، فقال عمر لم تمنع اخاک ما ينفعه وهو لک نافع تسقی به اولا و آخرا وهو لا يضرک، فقال محمد لا والله، فقال عمر والله ليمرن به ولو علی بطنک فامره عمر ان يمر به ففعل الضحاک۔

■... یحییٰ مازنی سے روایت ہے کہ ضحاک بن خلیفہ نے پانی کی ایک کھال وادی عریض سے نکالی اور چاہا کہ اس کو محمد بن مسلمہ کے رقبے میں سے گزارے تو محمد بن مسلمہ نے انکار کر دیا۔ ضحاک نے کہا کہ آپ کیوں روکتے ہیں جبکہ اس میں آپ کا بھی نفع ہے۔ آپ مجھ سے پہلے اس میں سے لے گے اور آخر میں بھی آپ کا حق رہے گا اور آپ کا اس میں کچھ نقصان بھی نہیں ہے لیکن محمد بن مسلمہ نے انکار ہی کیا۔ ضحاک نے اس بارے میں حضرت عمر بن خطابؓ سے بات چیت کی۔ حضرت عمرؓ نے محمد بن مسلمہ کو بلایا اور کہا کہ ان کا راستہ چھوڑ دیں۔ محمد بن مسلمہ نے انکار کیا۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ آپ اپنے بھائی کو اس چیز سے کیوں روکتے ہو جس میں آپ کا بھی نفع ہے اور اول اور آخر اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔ نیز اس میں آپ کا کوئی نقصان بھی نہیں ہے۔ محمد بن مسلمہ نے قسم کھا کر انکار کیا۔ حضرت عمرؓ نے بھی قسم کھا کر کہا کہ یہ ضرور اپنی کھال نکالیں گے اگرچہ تمہارے پیٹ پر سے نکالنی

پڑے۔ حضرت عمرؓ نے ضحاک کو حکم دیا کہ کھال نکالیں تو انہوں نے ایسا ہی کیا۔

وضاحت:

"عریض" وادی کا نام ہے۔ "خلیج" سے مراد معروف معنی میں خلیج نہیں ہے۔ لیکن ہے یہ اسی طرح کی چیز۔ بہت چھوٹے پیمانے پر۔ برساتی ندی نالے ہر جگہ ہوتے ہیں۔ مدینہ کے گردونواح میں جب بارش ہوتی تو بعض جگہوں پر پانی زیادہ جمع ہو جاتا۔ مدینہ کے لوگ وہاں سے اپنے باغوں کے لیے نالیاں نکال لیتے تھے۔ اسی طرح کی ایک بڑی نالی یا کھال ضحاک نے بھی بنانی چاہی لیکن پانی کے ذخیرہ اور ان کے رقبے کے درمیان محمد بن مسلمہ کی زمین حائل تھی جنہوں نے ضحاک کو اپنی زمین میں سے کھال نکالنے کی اجازت نہ دی۔

محمد بن مسلمہ بڑے جلیل القدر صحابی ہیں لیکن عجیب بات ہے کہ انہوں نے انکار کر دیا جس پر خلیفہ کو مداخلت کرنی پڑی اور انہوں نے محمد بن مسلمہ کی خواہش کے علی الرغم ضحاک کو کھال نکالنے کی اجازت دے دی۔ اس اجازت کی بنیاد یہ تھی کہ محمد بن مسلمہ کا کھال سے سیراب ہونے کا فائدہ ظاہر تھا اور وہ کوئی نقصان ثابت نہیں کر سکے۔ ان کا انکار صرف اس بنیاد پر تھا کہ رقبہ ان کا ہے۔ اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ اس طرح کے معاملات میں حکومت یا کارپوریشن مداخلت کر سکتی ہے۔ بعض فقہا نے اس معاملے میں تشدد کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کسی کی ملکیت میں بغیر اس کی اجازت کے دخل نہیں دینا چاہیے۔ یہ مولویانہ فتوے ہے اور ٹھیک نہیں۔ بلاشبہ یہ اصول تو رہے گا کہ مالک کو کوئی ضرر نہ ہو اور اگر ضرر ہو تو نفع اس سے زیادہ ہونا چاہیے لیکن صرف اس بنیاد پر کہ آپ کا رقبہ ہے آپ دوسرے آدمی کو ایک فائدہ اٹھانے سے روک نہیں سکتے۔ حکومت کو حق ہے کہ وہ اس میں مداخلت کرے اور اس آدمی کو آپ کی مرضی کے خلاف اجازت دے دے۔

حدثنی مالک عن عمرو بن یحییٰ المازنی عن ابیہ انہ قال: کان فی حائط جدہ ربیع لعبدالرحمن بن عوف فاراد عبدالرحمن بن عوف ان یحولہ الی ناحیۃ من الحائط ھی اقرب الی ارضہ فمنعہ صاحب الحائط فکلم عبدالرحمن بن عوف عمر بن الخطاب فی ذلک فقضی عبدالرحمن بن عوف بتحویلہ۔

... یحییٰ مازنی کہتے ہیں کہ ان کے دادا کے باغ میں عبدالرحمنؓ بن عوف کے لیے ایک چھوٹی نالی تھی۔ عبدالرحمن بن عوف نے چاہا کہ اس کا رخ باغ کے اس گوشے کی طرف پھیر دیں جو ان کی زمین سے

(بقیہ صفحہ ۳۸ پر)

افادات فراہیؒ

خالد مسعود

قرآن میں تدبّر و تفکّر کا مقام

انسان کے لیے سعادت کی انتہا یہ ہے کہ وہ رضائے الٰہی کے حصول اور عہد فطرت کے ایفا کی جدوجہد کرے اور اللہ تعالیٰ کی غلامی اور اس پر دلی خوشی اور اطمینان کی کیفیت سے سرشار ہو۔ اس انتہائے سعادت تک پہنچنے کا وسیلہ قرآن مجید سے فائدہ اٹھانا، اسے سیکھنا اور سکھانا، اس پر عمل کرنا اور لوگوں کو اس کی ترغیب دینا ہے۔ قرآن کریم سے آدمی کا یہ تعلق اس کے ایمان و اسلام کی تصدیق کرتا اور اس فطرت انسانی کی تکمیل کرتا ہے جو مسجود ملائکہ بنی تھی۔ انتہائے سعادت کی طرف بلند ترین زینہ قرآن سے یہی تعلق ہے جبکہ ابتدائی زینہ انسان کی خاص صفت گویائی (نطق) کی تربیت ہے جو انسان کی تمام قلبی و ذہنی صفات کی تکمیل کا ذریعہ بنتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں انسان کی صفت گویائی جب صحیح خطوط پر ارتقا کرے اور اس میں کجی واقع نہ ہو تو اس کی منزل قرآن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بولنے اور پڑھنے والا اسی لیے بنایا کہ وہ اس ہدایت کو حاصل کرنے کے قابل ہو سکے جس کا وعدہ اس کے رب نے اس کے ساتھ کر رکھا ہے اور اللہ کی نشانیوں اور کلام سے فائدہ اٹھا سکے تاکہ اس کے اتارے ہوئے نور سے روشنی پائے اور اس پر رب کی نعمت اور رحمت کی تکمیل ہو۔ قرآن میں ارشاد ہوا

الرحمن علم القرآن خلق الانسان علمہ البیان (الرحمن ۱ تا ۴)

(خدائے رحمان نے قرآن کی تعلیم دی۔ اسی نے انسان کو پیدا کیا، اسی نے اس کو بولنا سکھایا)

ہم نے جو کچھ اوپر بیان کیا اس کی طرف ان آیات میں نہایت مختصر الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ ابتدا اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے ذکر سے کی کیونکہ وہی رحمت اور تعلیم کا آغاز کرنے والی ہے۔ پھر یہ بتایا کہ خدا کی رحمت کی تکمیل قرآن مجید کی تعلیم کے ذریعہ سے ہوتی۔ پھر فرمایا کہ خدائے رحمان نے ہی تمہیں زندگی بخشی اور بولنا سکھایا تاکہ تم قرآن مجید کی یہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ یہیں سے سنن ابن ماجہ کی اس روایت کی حکمت واضح ہوتی ہے کہ خیر کم من تعلم القرآن و علمہ (تم میں سے بہترین آدمی وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کو چونکہ اللہ تعالیٰ سے سیکھا اور امت کو اس کی تعلیم دی، اس لیے حضورؐ بلا شک و شبہ سب سے بہتر انسان تھے۔

حضورؐ کے بعد لوگوں میں سب سے اچھے وہ ہیں جنہیں حضورؐ نے تعلیم دی اور انہوں نے آگے یہ علم پھیلایا۔ علی ہذاالقیاس، فرق مراتب کے ساتھ اسباب و وسائل کی کثرت و قلت، خلوص نیت اور استقلال کی کمی بیشی کے مطابق دوسرے لوگوں کا درجہ ہے۔ پروردگار کی تعلیم قبول کرنے اور اس کے بندوں تک اس کو پہنچانے سے بڑی بھلائی کیا ہو سکتی ہے؟ انسان کے لیے اس سے بڑھ کر خیر و برکت کی چیز بھلا کیا ہوگی کہ وہ اس مقصد کو پالے جس کے لیے اللہ نے اسے پیدا کیا؟ اگر تم یہ کہو کہ خدا نے تو انسان کو عمومی طور پر عبادت کے لیے پیدا کیا تھا پھر وہ اس کو قرآن کے سیکھنے سکھانے کے مخصوص کام کے لیے کیوں تیار کرنا چاہتا ہے تو ہمارا جواب یہ ہے کہ ہر قوم خدا ہی کی عبادت کی دعویدار ہے مگر اس کی عبادت باطل اور ضائع ہوتی ہے جب تک وہ رب کی تعلیم اور ہدایت کے مطابق نہ ہو۔ قرآن تو ہے ہی رب کی تعلیم اور ہدایت۔ اس اعتبار سے یہ عبادت کی بنیاد، اس کا محور اور عبودیت کا مغز اور جوہر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کی تلاوت عبادت قرار پائی ہے۔

قرآن فہمی کا دارومدار تدبر پر ہے:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

ھوالذی خلق لکم مافی الارض جمیعا (بقرہ ۲۹)

(وہی ہے جس نے تمہارے لیے وہ سب کچھ پیدا کیا جو زمین میں ہے)

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہم زمین کی بے شمار اشیاء کو اپنے استعمال میں لاتے ہیں۔ ان میں سے کتنی اشیاء ایسی ہیں جن کو ہم پہلے بے خبری میں استعمال کرتے رہے لیکن بعد میں اللہ تعالیٰ نے ہمارے علم میں اضافہ کر دیا تو ہم نے ان کو اپنے لیے مزید نفع بخش بنالیا۔ کتنی اور چیزیں ایسی ہیں جن کے فوائد ہم پر ابھی تک مخفی ہیں۔ ہم روز بروز ان کے بارے میں اپنی معلومات کو بہتر بنا رہے ہیں اور ایسا کرنے کے بعد ان کو استعمال میں لائیں گے۔ اس کے باوجود لاتعداد اشیاء پھر بھی ایسی باقی رہ جائیں گی جن کے اسرار سے ہم واقف نہ ہو سکیں گے۔ ٹھیک یہی حال علوم کا ہے۔ ان میں بھی روز بروز اضافہ ہو رہا ہے اور جب تک اللہ چاہے گا یہ اضافہ ہوتا رہے گا۔

علی ہذاالقیاس، قرآن کی صفت یہ ہے کہ یہ بیان کا سہل ترین طریقہ اختیار کرتا ہے اور یہ اپنے مفہوم میں واضح اور روشن کتاب ہے۔ اسی بنا پر اس کو نور اور تفصیل قرار دیا گیا ہے۔ لیکن یہ نور اسی معنی میں ہے جس معنی میں سورج آنکھیں رکھنے والوں کے لیے ایک واضح چیز ہے۔ وہ اندھوں کو نظر نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن اپنے قارئین سے تدبر، تفکر اور توسم کا مطالبہ کرتا ہے۔ اور یہ پڑھنے والے پر اسی قدر کھلتا ہے جتنا وہ اس پر غور کرتا ہے۔ یہ کتاب اگرچہ ہمیشہ سے نفع بخش، ہدایت دینے والی اور

واضح ہے لیکن اس کے ساتھ یہ گہری حکمتوں اور ادب کی باریکیوں کا سرچشمہ بھی ہے۔ جس طرح دوسرے علوم میں آدمی جوں جوں ترقی کرتا ہے وہ معلوم سے غیر معلوم تک رسائی حاصل کرتا چلا جاتا ہے، اسی طرح قرآن مجید میں بھی ارشاد ہوا۔

والذین اہتدوازادھم ھدی واتھم تقوھم (محمد ۱۷)

"اور وہ لوگ جنہوں نے ہدایت کی راہ اختیار کی اللہ نے ان کی ہدایت میں افزونی بخشی اور ان کے حصہ کا تقویٰ ان کو عطا کیا۔"

یعنی جو لوگ ہدایت پاتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے علم اور عمل میں اضافہ فرماتا ہے۔

قرآن کے ظاہر سے اس کے باطن تک رسائی:

قرآن مجید کے بعض پہلو ظاہر ہیں۔ ان سے جب ہم رہنمائی حاصل کرتے ہیں تو اس باطن سے آگاہ ہوتے ہیں جو اس ظاہر کے پیچھے چھپا ہوتا ہے۔ اب وہ باطن ہمارے لیے ظاہر کے حکم میں ہو جاتا ہے۔ اگر ہم قرآن پر برابر غور و فکر کرتے رہیں تو قرآن فہمی میں ہم درجہ بدرجہ ترقی کرتے جاتے ہیں لیکن قرآن کے عجائب ختم نہیں ہوتے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہر ظاہر باطن کی تمہید ہوتا ہے۔ تدبر کرتے وقت ہم نہ کسی کلمہ کو اس کی جگہ سے ہٹاتے اور نہ قرآن کے معانی ظاہر کے خلاف کرتے ہیں۔ اس کے باوجود ایک کے بعد دوسری نئی حقیقت روشنی میں آجاتی ہے۔ اس معاملہ کو یوں سمجھو جیسے ہم ایک شعر پڑھتے ہیں اور اس کے معنی سے واقف ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد اس پر غور کرتے ہیں تو اس کے اندر صنعت اور بدیع کی بعض خوبیوں سے آگاہ ہوتے ہیں۔ مزید غور کرتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا مضمون عین حق ہے اور کئی حکمتوں سے بڑھ کر نفع بخش ہے۔ شعر پر جتنا زیادہ غور کرتے ہیں تو نئی معلومات کی نوعیت یہ نہیں ہوتی کہ وہ ابتدائی مفہوم کے خلاف ہو جائیں بلکہ یہ علم پر اضافہ در اضافہ ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں ہم نے شعر کا وہ مفہوم نہیں بدلا جو آغاز میں سمجھا تھا بلکہ شعر کے محاسن ہم پر واضح ہوتے۔

اب ایک دوسری مثال پر غور کرو۔ آپ دور سے نہایت متناسب تعمیر کا ایک محل دیکھتے ہیں تو اس کے قریب جاتے ہیں۔ جوں جوں آپ اس کے نزدیک ہوتے ہیں اس کی ترکیب اور نقوش کی خوبیاں آپ کے علم میں آتی ہیں۔ پھر آپ اس کے اندر داخل ہو جاتے ہیں تو وہاں ایسا ساز و سامان پاتے ہیں جس کو دیکھ کر آپ کی آنکھیں ٹھنڈی اور آپ کا دل لذت پاتا ہے۔ اگر آپ کو اس محل میں ٹھہرنے کا موقع ملتا ہے تو آپ محسوس کرتے ہیں کہ اس کے کمروں کی ساخت ایسی ہے جس سے طبیعت کھلتی ہے اور گرمی اور سردی دونوں کی ضروریات کا اس میں لحاظ رکھا گیا ہے۔ آپ اس میں سونے، آرام کرنے اور نہانے کے کمرے موجود پاتے ہیں۔ وہاں پاکیزہ مشغلوں کے لیے سر و سامان موجود ہے الغرض

کھانے اور شیریں و خوشگوار مشروب میسر ہیں۔ کچھ عرصہ وہاں قیام کے بعد کسی گوشے میں آپ کو ایک خفیہ دروازہ نظر آتا ہے اور اس کو کھولنے کی چابی ہاتھ آجاتی ہے۔ اس کو کھولتے ہی آپ ایک ایسے خزانے میں جا پہنچتے ہیں جس میں موتیوں، یاقوت اور قیمتی پتھروں کا کوئی شمار نہیں۔ اس کو پاکر آپ کے سرور و مسرت میں بے حد اضافہ ہو جاتا ہے۔ پھر اس خزانے کے ایک ایسے حصے میں آپ جا پہنچتے ہیں جس کو آج تک نہ آنکھوں نے دیکھا نہ کانوں نے سنا اور نہ کسی انسان کے دل میں اس کا خیال ہی آیا۔ ٹھیک یہی صورت حال قرآن مجید پر غور و فکر کے دوران پیش آتی ہے اور اس پر تدبر کرنے والا برابر نئے نئے حقائق سے آگاہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ نئے حقائق قرآن کے ظاہر کے منافی نہیں ہوتے بلکہ علم میں اضافہ پر اضافہ ہوتے ہیں۔

ایک حقیقت دوسری حقیقت کی راہ کھولتی ہے:

جہاں تک اس امر کا تعلق ہے کہ قرآن کا باطن اس کے ظاہر کے نیچے چھپا ہوتا ہے تو یہ اس اعتبار سے ہے کہ ایک حق دوسرے حق کے ساتھ موافقت رکھتا ہے جبکہ باطل اس وقت زائل ہو جاتا ہے جب اس کے مقابل میں حق آجائے۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح تاریکی کو ختم کرنے کے لیے روشنی اور ہر عقدہ کا حل پیدا کر دیا ہے، اسی طرح ہر باطل کے مقابل میں اس نے حق کو بھی پیدا کیا ہے۔ اگر باطل پر حق کو غلبہ حاصل نہ ہو سکتا تو دونوں کا معاملہ یکساں ہو جاتا اور یہ ماننا پڑتا کہ معبود ایک نہیں دو ہیں، بلکہ دو سے بھی زیادہ ہیں کیونکہ باطل کی شکلیں لاتعداد ہیں۔ اس صورت میں دنیا ہر قسم کے نظم اور حکمت سے خالی ایک کھلونا قرار پاتی۔ مزید یہ ہوتا کہ چونکہ باطل اور باطل میں ٹکراؤ ہوتا ہے اس لیے دنیا فساد کا شکار ہو جاتی۔ پس دنیا کا وجود حق کی حکمرانی اور پائیداری کی دلیل ہے۔ مزید برآں یہ اس بلند و بالا حق کی دلیل ہے جو دنیا کے وجود کا آغاز بنا۔

قرآن مجید نے یہ تمام حقیقت خود بیان کر دی ہے۔ فرمایا

جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقا (اسراء ۸۱)

(حق آگیا اور باطل نابود ہو گیا اور باطل نابود ہونے والی چیز ہے)

اس دلیل کو دوسری جگہ زیادہ واضح کر دیا ہے فرمایا:

وما خلقنا السماء والارض وما بینھما لعبین لو اردنا ان نتخذ لھوا لا تخذنہ من لدنا ان کنا فعلین بل نقذف بالحق علی الباطل فید مغہ فاذا ھو زاھق ولکم الویل مما تصفون ولہ من فی السماوات والارض و من عندہ لا یستکبرون عن عبادتہ ولا یستحسرون یسبحون الیل والنھار لا یفترون ام اتخذوا الھۃ من الارض ھم ینشرون لو کان فیھما الھۃ

الا اللہ لفسدتا فسبحن اللہ رب العرش عما یصفون (انبیاء ۱۶-۲۲)

(اور ہم نے آسمان و زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کھیل تماشہ کے طور پر نہیں بنایا ہے۔ اگر ہم کوئی کھیل ہی بنانا چاہتے تو خاص اپنے پاس ہی بنا لیتے۔ اگر ہم یہ کرنے والے ہی ہوتے! بلکہ ہم حق کو باطل پر دے ماریں گے تو وہ اس کا بھیجا نکال دے گا تو دیکھو گے کہ وہ نابود ہو کے رہے گا۔ اور تمہارے لیے اس چیز کے سبب سے جو تم بیان کرتے ہو بڑی خرابی ہے۔ اور اسی کے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور جو اس کے پاس ہیں۔ وہ اس کی بندگی سے نہ سرتابی کرتے اور نہ تھکتے۔ وہ شب و روز اس کی تسبیح کرتے ہیں اور دم نہیں لیتے۔ کیا انہوں نے زمین کے الگ معبود ٹھہرا لیے ہیں، وہ زمین کو شاداب کرتے ہیں؟ اگر ان دونوں کے اندر اللہ کے سوا الگ الگ الٰہ ہوتے تو یہ دونوں درہم برہم ہو کے رہ جاتے۔ تو اللہ، عرش کا مالک، ان چیزوں سے پاک ہے جو یہ بیان کرتے ہیں)۔

'کھیل خاص اپنے پاس ہی بنا لیتے' کا مفہوم یہ ہے کہ تمہیں مصیبت میں مبتلا نہ کرتے۔ 'اگر ہم یہ کرنے والے ہی ہوتے' کا مفہوم یہ ہے کہ یہ بات ماننا ہماری ذات کے حوالے سے بعید از فہم ہے۔ پھر اپنے مقرب ملائکہ کے بارے میں وضاحت کی ہے کہ وہ اللہ کے بندے ہیں، ان میں کوئی الٰہ نہیں۔ وہ تو کھیل میں بھی دلچسپی نہیں رکھتے بلکہ تسبیح میں مشغول رہتے ہیں۔ یہی حال ان فرشتوں کا ہے جو زمین میں ہوتے ہیں۔ وہ زمین کو شاداب کرنے کا فرض انجام دیتے ہیں۔ الوہیت کے لیے وہ بھی موزوں نہیں۔ لہٰذا واحد متصرف ذات اللہ کی ذات ہے۔ اسی کے قبضہ میں آسمان و زمین کا مرکز حکومت ہے۔

آپ نے دیکھا کہ ایک حقیقت کس طرح دوسری حقیقت کی راہ کھولتی جاتی ہے۔

باطل اور باطل میں ٹکراؤ کے برعکس حق کی تمام شکلیں ایک دوسرے سے موافقت رکھتی ہیں اس لیے جب ایک حق آدمی پر منکشف ہوتا ہے تو وہ اس کی پہلے سے معلوم حقیقتوں کے ساتھ ایک نئی مناسبت کو منظر عام پر لاتا ہے۔ دنیاوی علوم میں بھی یہ امر مشاہدہ میں آتا ہے کہ علم میں نیا اضافہ پہلے علم میں کئی پہلوؤں سے اضافہ کر دیتا ہے کیونکہ ایک حقیقت، بہت ساری حقیقتوں کو روشنی میں لانے کا باعث ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علماء چھوٹی سے چھوٹی حقیقت جاننے کے لیے بھی بے تاب ہوتے ہیں کیونکہ کوئی حقیقت اصل میں چھوٹی نہیں ہوتی بلکہ جن نئی حقیقتوں کا دروازہ کھول دیتی ہے ان کی عظمت کے باعث یہ خود عظیم ہوتی ہے۔

قرآن کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ جب جب اس کے علم میں تم اضافہ کرو گے یہ اس کے معانی پر سے پردہ اٹھا دے گا۔ کسی شخص کے لیے یہ روا نہیں کہ جب تک حق ثابت نہیں ہوا اور شک کا پردہ باقی ہے وہ قرآن کی کوئی تاویل بیان کرے۔ کیونکہ جو چیز حق نہیں ہوتی اس کا تار و پود خود ہی بکھر جایا کرتا

ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں نے اپنے نفسانی اوہام اور سروں میں سماتے ہوئے سودا کے مطابق قرآن کی تفسیر کی ان کی حماقتیں ہر شخص دیکھ سکتا ہے۔ لہٰذا یہ امر واجب ہے کہ آدمی قرآن کی واضح و محکم آیات کو اور مشہور ذخیرہ خبر میں سے جو کچھ ثابت ہو اس کو مضبوطی سے پکڑ لے۔ اسی طرح ہر حق کو جس کا انکشاف ہو مضبوطی سے پکڑنا ضروری ہے۔ یہاں تک کہ اس حق کو بھی جو کسی دوسرے علم کے ذریعہ سے آئے۔ صرف اس حق کو لینا کافی نہیں جس کو لوگ ذہنی تیاری کے لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ بطور رہنما کام آئے گا۔ اس کی حیثیت محض ایک رائے اور اندازہ کی ہوتی ہے۔ اصل علم تو خدائے خبیر کی طرف سے آتا ہے۔

یہیں سے پختہ کار علماء کی علم کے بارے میں احتیاط سمجھ میں آتی ہے۔ وہ کسی کی تقلید نہیں کرتے بلکہ صرف اس بات پر اعتماد کرتے ہیں جو روشن ہوتی ہے۔ ایک مقلد جس کی آنکھیں باطل کی چمک سے چندھیا گئی ہوں جہاں مشکل میں پڑ جاتا ہے وہاں یہ علماء رک جاتے ہیں اور لا اعلم (میں نہیں جانتا) کہنے کی طرف ان کی میلان زیادہ ہوتا ہے۔ میں نے حضرت ابوبکرؓ کا یہ قول سنا ہے کہ ای ارض تقلنی وای سماء تظلنی ان قلت بالا اعلم (اگر میں اس چیز کے بارے میں کلام کروں جس کا علم نہیں رکھتا تو کون سی زمین مجھے اٹھائے گی اور کون سا آسمان مجھ پر سایہ کرے گا) اسی طرح امام مالکؒ کا قول ہے عندی من لا ادری مالو کان مثلہ عند احد کم من الابل کان غنیا (میرے پاس "میں نہیں جانتا" کا اتنا ذخیرہ ہے کہ تم میں سے کسی کے پاس اتنے اونٹ ہوں تو وہ غنی ہو جائے) محض رائے یا جھوٹے اندازے پر مبنی بات کرنے سے جب آدمی کنارہ کش ہو جائے تو پھر جو کچھ باقی رہتا ہے وہ واضح اور ثابت حق ہوتا ہے۔

قرآن فہمی کے لیے ہر علم صحیح کا حصول مفید ہے:

جب تم یہ بات جان چکے کہ ہر نیا حق قرآن کے معانی کا ایک نیا پہلو واضح کرتا ہے جو ان ثابت حقیقتوں کا اثبات، تائید اور وضاحت کرتا ہے جو پہلے سے تمہارے پاس ہوتی ہیں، تو قرآن کے فہم ہی کی خاطر یہ لازم ہوا کہ آدمی ہر علم صحیح کو حاصل کرے۔ ہمارے نبی مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب فرمایا کہ الحکمۃ ضالۃ المومن (حکمت مومن کی ایک گمشدہ متاع ہے) تو آپ نے اسی چیز کی طرف ہماری رہنمائی فرمائی تھی۔ اسی سبب سے صحابہ کرامؓ علم حاصل کرنے کے بڑے حریص تھے۔ وہ جو کچھ نہیں جانتے تھے اس کے بارے میں برابر سوال کرتے اور جواب سنتے۔ اللہ تعالیٰ نے نعمتیں اپنی مخلوق میں بانٹ دی ہیں تاکہ وہ سب ایک دوسرے سے ملیں اور باہم تعاون کریں۔ لہٰذا اگر تمہارے پاس ایک قیمتی موتی ہو تو اس پر اترانے کا فائدہ؟ اللہ تعالیٰ کے پاس اس سے کہیں زیادہ بیش قیمت موتی معلوم نہیں کتنی تعداد میں ہوں گے۔ اسی لیے قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

وفوق کل ذی علم علیم (یوسف ٧٦)

"اور ہر علم والے سے بالاتر ایک علم والا ہے۔"

حضرت آدمؑ اور حضرت موسیٰؑ کے واقعات میں اس بارے میں نہایت دلنشیں سبق موجود ہے۔ [1] پس کوئی شخص، خواہ وہ خود ہی نبی ہو، علم حاصل کرنے سے بالا نہیں ہوتا اور سوال کرنے سے قدر و منزلت میں کمی نہیں ہوتی بلکہ اضافہ ہوتا ہے۔ تمہارا یہ کہنا روا نہ ہوگا کہ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں، قرآن میرے لیے کافی ہے۔ قرآن یقیناً کافی ہے لیکن وہ اسی طرح کافی ہے جس طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لیے کافی ہے۔ کیا تمہیں اس سے مانگنے اور جدوجہد کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی جبکہ انسان تو وہی کچھ پاتا ہے جس کے لیے وہ جدوجہد کرتا ہے۔ کیا سورج کی روشنی تمہارے لیے کافی نہیں ہوتی لیکن اس کے کافی ہونے کے لیے یہ بھی تو ضروری ہوتا ہے کہ تم تاریکیوں اور پردوں میں سے نکل کر باہر آجاؤ۔ ہر لاعلمی ایک پردہ ہوتا ہے اور ہر حق روشنی۔ روشنی کو حاصل کرنے کے لیے ہمہ وقت آمادگی لازم ہے۔

[1] یہ اشارہ حضرت آدمؑ کے واقعہ کی طرف ہے کہ انہوں نے اسماء کا علم حاصل کیا تو اس کے بعد ملائکہ تخلیق آدم کی حکمتوں سے بہرہ ور ہو گئے۔ اسی طرح حضرت موسیٰؑ کی تربیت متقاضی ہوئی تو ان کو حکمت کے رموز سیکھنے کے لیے خضرؑ کے پاس بھیجا گیا۔ (مترجم)

قرآن پر تدبر واجب ہے:

قرآن مجید میں تدبر و تفکر کے واجب ہونے کی متعدد دلیلیں بیان ہوئی ہیں مثلاً

الف۔ قرآن نے متعدد آیات میں صراحت کے ساتھ اس کا حکم دیا ہے۔

ب۔ قرآن کی بعض آیات میں تدبر، استدلال اور غور و فکر کے مواقع کی نشان دہی کر دی گئی ہے مگر تدبر کے بعد ان سے جو حقیقت کھلتی ہے اس کو بیان نہیں کیا گیا بلکہ اس کو قاری کے فہم پر چھوڑ دیا ہے۔

ج۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح احکام شریعت کی تعلیم دینے پر مامور تھے اسی طرح حکمت کی تعلیم بھی آپ کی ذمہ داری تھی۔ چنانچہ آنحضرتؐ نے اس کی تعلیم دی، اس کا شوق دلایا اور حکمت کی راہوں کی طرف رہنمائی دی۔ آپ کا دستور یہ تھا کہ کبھی کبھی صحابہ کرامؓ کے سامنے کوئی مسئلہ پیش فرما دیتے تاکہ وہ خود اس سے کوئی نتیجہ اخذ کریں۔ مثلاً صحیح بخاری میں حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے پوچھا کہ درختوں میں وہ کون سا درخت ہے جس کے پتے نہیں جھڑتے اور وہ مسلمان سے مشابہت رکھتا ہے۔ لوگ صحرا کے درختوں کا سوچنے لگے۔ عبد اللہؓ کہتے ہیں

کہ میرے دل میں کھجور کے درخت کا خیال گزرا۔ پھر لوگوں نے عرض کی "یارسول اللہ! آپ ہی ارشاد فرمائیں۔" حضورؐ نے فرمایا "یہ کھجور کا درخت ہے۔"

حضورؐ نے سوال کرنے سے بھی منع فرمایا تھا۔ منع سوال کا مقصد دوسرے مصالح کے علاوہ یہ تھا کہ لوگ خود بھی عقل اور سمجھ کو استعمال کریں۔ صحیح بخاری باب العلم میں حضرت ثابت بن انسؓ سے روایت ہے کہ

"ہمیں قرآن میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کرنے سے روکا گیا تو ہمیں اس بات سے خوشی ہوتی کہ دیہاتیوں میں سے کوئی عقل مند آدمی آکر حضورؐ سے سوال کرے جبکہ ہم سن رہے ہوں"۔

یہاں حضرت ثابتؓ کا منع سوال سے اشارہ آیت یاایھاالذین آمنوالا تسئلوا عن اشیاء ان تبد لکم تسؤکم (مائدہ ۱۰۱) (اے ایمان والو، ان چیزوں کے بارے میں سوال نہ کرو جو اگر تمہارے لیے ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں بری لگیں) کی طرف ہے اور "عقل مند آدمی" کہنے سے ان کی مراد شاید یہ ہے کہ وہ کسی اہم اور مفید معاملہ میں سوال کرتا۔

صحابہؓ کا طریقہ یہ تھا کہ اپنی مجلسوں میں قرآن مجید کے معانی کے بارے میں سوال کرتے اور ان پر سوچا کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ کے بارے میں آتا ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ لوگوں سے پوچھا کہ سورۃ نصر میں کس بات کا اشارہ ہے۔ مجلس میں جتنے بڑے لوگ تھے ان میں سے کوئی اس سوال کا جواب نہ دے سکا۔ البتہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اپنی رائے ظاہر کی، جس کی حضرت عمرؓ نے تصدیق کی۔ ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے عبداللہ بن عباسؓ کے اندر فہم قرآن اور تفقہ فی الدین کا شوق دیکھا تو ان پر زیادہ عنایت کرنے لگے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید سے استفادہ کا دارومدار اس کے سمجھنے پر ہے۔ یہ کام بڑا غوروفکر چاہتا ہے۔ ہمارے یہاں لوگوں نے جب آیات اللہ میں غوروفکر ترک کر دیا تو سنت کو بدعت اور بدعت کو سنت قرار دینے لگ گئے۔ یہ حقیقت کتنی تکلیف دہ ہے کہ خود اہل حق کے ہاں حق اور باطل مشتبہ ہو جائیں اور ان کے اندر حق کی بجائے باطل کی عصبیت پیدا ہو جائے۔

اسالیب قرآن
خالد مسعود

حذف فعل

جملے میں فعل کے حذف کا اسلوب قرآن میں عام استعمال ہوا ہے۔ اس کی متعدد شکلیں ہیں جن کو ہم ایک ترتیب کے ساتھ مثالیں دے کر بیان کریں گے۔

الف۔ التفات کے انداز کا حذف:

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ بعض مقامات میں سلسلہ کلام میں غائب کے بعد یکایک حاضر یا حاضر کے بعد غائب وغیرہ کے صیغے آجاتے ہیں اور کلام کا رخ بدل جاتا ہے۔ یہ شکل التفات کی ہوتی ہے۔ اس کے مماثل بعض جملے قرآن مجید میں ایسے بھی آتے ہیں جہاں التفات مقصود نہیں لیکن جملے کا انداز التفات کا سا ہوتا ہے جس میں ضمیریں بدل جاتی ہیں۔ عام طور پر ان جملوں سے قبل قال، قالوا یا قیل وغیرہ فعل کو محذوف مانا جاتا ہے جبکہ بعض مقامات میں یہ ماننا ضروری نظر نہیں آتا کہ یہ قول زبان ہی سے ہو۔ یہ قول زبان حال سے بھی مراد ہو سکتا ہے۔ صیغوں کی اچانک تبدیلی سے ایک قاری اس حذف پر آسانی سے متنبہ ہو جاتا ہے۔ یہی چیز فعل حذف کا جواز فراہم کرتی ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

۱۔ وظللنا علیکم الغمام وانزلنا علیکم المن والسلوی کلوا من طیبات ما رزقناکم
(البقرہ ۵۷)

"اور تم پر ہم نے بدلیوں کا سایہ کیا اور تم پر من وسلوی اتارے۔ کھاؤ ان پاکیزہ چیزوں میں سے جو ہم نے تم کو بخشی ہیں۔"

اس آیت کا آغاز ماضی سے ہوا ہے جبکہ آخری حصہ میں صیغہ امر سے پاکیزہ چیزیں کھانے کی تلقین کی گئی ہے۔ اس آیت میں بنی اسرائیل پر اللہ تعالی کے افضال وعنایات کا ذکر ہے۔ من وسلوی کی نعمتیں زبان حال سے کہتی تھیں کہ خدا کی اس عطا سے فائدہ اٹھاؤ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالی کی ہر نعمت اپنی صورت وہیئت سے یہی دعوت دیتی ہے کہ اس نعمت الہی کو برتو۔ "کلوا" سے قبل تمتعا کو

محذوف بھی مانا جاسکتا ہے۔

۲۔واذاخذنا میثاقکم ورفعنا فوقکم الطور خذوا ما اتینکم بقوۃ (بقرہ ۶۳)

" اور (یاد کرو) جب ہم نے تم سے تمہارا عہد لیا اور اٹھایا تمہارے اوپر طور کو۔ پکڑو اس چیز کو جو ہم نے تم کو دی ہے۔ مضبوطی کے ساتھ۔ "

اس آیت میں صیغہ فعل کی تبدیلی اوپر والی آیت جیسی ہے۔ یہاں بنی اسرائیل کو کتاب آسمانی عطا کیے جانے کا ذکر ہے۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے اپنی عظمت و قدرت کا مظاہرہ فرمایا اور بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ وہ زندگی کے تمام مراحل میں پورے عزم اور استقامت کے ساتھ اس کے احکام پر عمل کریں گے۔ خذوا سے پہلے قلنا کو محذوف کر دیا گیا ہے کیونکہ آگے کا جملہ اسی عہد کی تعبیر ہے جس کا ذکر پہلے ہوا۔

۳۔امن الرسول بما انزل الیہ من ربہ والمومنون کل امن باللہ وملائکتہ وکتبہ ورسلہ۔ لا نفرق بین احد من رسلہ (بقرہ ۲۵۹)

" رسول ایمان لایا اس چیز پر جو اس پر اس کے رب کی جانب سے اتاری گئی اور مومنین ایمان لائے۔ یہ سب ایمان لائے اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر۔ (ان کا اقرار ہے کہ) ہم خدا کے رسولوں میں کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے۔ "

یہاں پہلے غائب کا صیغہ استعمال ہو رہا تھا کہ یکایک لا نفرق سے متکلم کا صیغہ آگیا۔ اس جملہ سے پہلے "یقولون" کا لفظ محذوف مان سکتے ہیں کیونکہ آگے کا جملہ امت کی طرف سے رسولوں کے باب میں اپنے اس عقیدہ کے اعلان و اظہار پر مشتمل ہے کہ وہ ان کے بارے میں کسی تعصب میں گرفتار نہیں ہے۔

ب۔ فعل ناقص کا حذف:

قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ماضی کی سرگزشت میں مضارع کا صیغہ استعمال ہوا ہے حالانکہ اس سے بھی اشارہ ماضی ہی کی طرف مقصود ہوتا ہے۔ چونکہ فعل مضارع حال اور مستقبل کی تعبیر کے لیے آتا ہے اس لیے قاری مفہوم کے تعین میں مشکل محسوس کرتا ہے۔ یہ معلوم ہے کہ فعل مضارع کے ساتھ افعال ناقصہ (کان، صار، اصبح وغیرہ) مل کر ماضی کے معنی دیتے ہیں اس لیے مذکورہ مواقع میں بالعموم فعل ناقص کو حذف کر دیا گیا ہوتا ہے مثلاً

۱۔ونرید ان نمن علی الذین استضعفوا فی الارض (قصص ۵)۔

" ہم یہ چاہتے تھے کہ ان لوگوں پر احسان کریں جو ملک میں دبا کر رکھے گئے تھے "

اس موقع پر فرعون کی سرکشی کا حوالہ ہے کہ وہ تو ظلم و تعدی کی اسکیموں کو بروئے کار لا رہا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ اس کے ہاتھوں پسے ہوتے بنی اسرائیل پر اپنا فضل و کرم کرے۔ یہ ماضی کا واقعہ ہے جبکہ نرید مضارع ہے۔ لہذا یہاں اصل میں کنا نرید تھا۔ فعل ناقص کنا کو حذف کر دیا گیا۔

۲۔ما یعبدون الا کما یعبد آباؤھم من قبل (ھود ۱۰۹)

" یہ اسی طرح پوج رہے ہیں جس طرح ان سے پہلے ان کے باپ دادا پوجتے رہے۔ "

اس آیت میں کما یعبد سے مراد کما کان یعبد ہے کیونکہ یہ ماضی کا حوالہ ہے۔

۳۔ومن قوم موسیٰ امۃ یھدون بالحق وبہ یعدلون (اعراف ۱۵۹)

" اور موسیٰ کی قوم میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی ہوا جو حق کے مطابق رہنمائی کرتے اور اسی کے مطابق انصاف کرتے تھے۔ "

یہ بھی ماضی کی ایک سرگزشت ہے۔ اس میں یھدون اور یعدلون کے مضارع کے صیغے ماضی استمراری کا مفہوم دے رہے ہیں۔ یعنی ان سے پہلے فعل ناقص کانوا حذف کر دیا گیا ہے۔

۴۔فلما ذھب عن ابراھیم الروع وجاءتہ البشری یجادلنا فی قوم لوط (ھود ۷۴)

" تو جب ابراہیم کا خوف دور ہوا اور اس کو بشارت ملی تو وہ ہم سے قوم لوط کے بارے میں بحث کرنے لگا "۔

یہاں بھی مراد صار یجادلنا ہے۔ یعنی فعل ناقص صار حذف ہے۔

۵۔ویصنع الفلک وکلما مر علیہ ملا من قومہ سخروا منہ (ھود ۳۸)

" اور وہ کشتی بنانے لگا۔ اور جب جب اس کی قوم کے بڑوں کی کوئی جماعت پاس سے گزرتی تو اس کا مذاق اڑاتی۔ "

ماضی کی اس سرگذشت میں حضرت نوح علیہ السلام کے کشتی بنانے کا ذکر ہے۔ فعل مضارع یصنع سے پہلے جعل حذف ہے۔ اس کے ساتھ مل کر ماضی استمراری کے معانی پیدا ہوتے ہیں۔

۶۔قد نری تقلب وجھک فی السماء فلنولینک قبلۃ ترضھا (بقرہ ۱۴۴)

" ہم آسمان کی طرف تمہارے رخ کی گردش دیکھتے رہے ہیں، سو ہم نے فیصلہ کر لیا کہ ہم تمہیں اس قبلہ کی طرف پھیر دیں جس کو تم پسند کرتے ہو "۔

مکہ میں مسلمان اہل کتاب کے طریقہ کے مطابق بیت المقدس کو قبلہ مان کر نماز ادا کرتے تھے۔ ہجرت کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو انتظار رہنے لگا کہ ابراہیمی قبلہ کی جانب رخ کرنے کا حکم کب ہوتا ہے۔ ہجرت کے ڈیڑھ برس بعد وہ ساعت آئی جب ان آیات میں تحویل قبلہ کا حکم ہوا۔ اصل حکم کی

تمہید کے طور پر ماضی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے انتظار کا حوالہ ہے۔ گویا اصل میں مراد قد کنا نری ہے جس میں سے فعل ناقص کنا کو حذف کر دیا گیا۔ یوں بھی حرف قد ماضی کے صیغہ پر ہی آیا کرتا ہے جبکہ یہاں نری مضارع کا صیغہ ہے۔

ج۔ اسم منصوب سے متعلق فعل کا حذف:

قرآن مجید میں بکثرت مواقع میں کوئی اسم منصوب موجود ہوتا ہے جو تقاضا کرتا ہے کہ وہ مفعول یا ظرف ہو لیکن اس کا متعلق فعل کلام میں موجود نہیں ہوتا۔ یہ وہ مواقع ہوتے ہیں جہاں سلسلہ کلام خود اس فعل کے حذف کو کھول رہا ہوتا ہے اور اس میں کوئی ابہام نہیں پایا جاتا۔ مثلاً

۱۔ والی عاد اخاھم ھودا (اعراف ۶۵)

"اور عاد کی طرف ان کے بھائی ھود کو (ہم نے بھیجا)"۔

اوپر آیت ۵۹ میں لقد ارسلنا نوحاً کے الفاظ آئے تھے۔ مندرجہ بالا آیات اور سلسلہ کلام میں آگے آنے والی متعدد اس کی مماثل آیات اسی پر عطف ہیں۔ ان سب میں فعل ارسلنا کو حذف کر دیا گیا ہے اور بھیجے گئے رسول کا نام منصوب لایا گیا ہے جو اس کے مفعول ہونے کا تقاضا کرتا ہے۔

سورۃ انبیاء کی متعدد آیات جن میں رسولوں کا ذکر ہے اسی اسلوب پر آتی ہیں لیکن وہاں سلسلہ کلام میں انبیاء و رسل پر اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل و کرم کا ذکر ہے۔ اس مناسبت سے وہاں مفہوم ہو گا "ہم نے نوح پر کرم کیا جب ......" (آیت ۷۶)

"ہم نے ایوب پر اپنا فضل کیا جب ......" (آیت ۸۳) وغیرہ

۲۔ و یعلمھم الکتاب والحکمۃ والتوراۃ والانجیل و رسولا الی بنی اسرائیل (آل عمران ۴۹)

"اور اللہ تعالیٰ اس کو کتاب اور حکمت، تورات اور انجیل سکھائے اور اس کو بنی اسرائیل کی طرف رسول (بنا کر بھیجے گا)"۔

یہاں لفظ رسولا منصوب ہے جس کا متعلق فعل موجود نہیں۔ مراد ہے۔ یبعثہ رسولا۔

۳۔ صبغۃ اللہ و من احسن من اللہ صبغۃ (بقرۃ ۱۳۸)

"اللہ کا رنگ (اختیار کرو) اور اللہ کے رنگ سے کس کا رنگ اچھا ہے۔"

یہاں موقع۔ یہود و نصاریٰ کو ابھارنے اور شوق دلانے کا ہے کہ وہ۔ یہودیت و نصرانیت کی فرقہ پرستی چھوڑ کو تمام انبیاء کو مانیں اور ان کی لائی ہوئی وحی پر ایمان لائیں تاکہ ان کے اوپر اصل اسلام کا رنگ چڑھ سکے۔ اس لیے اسم منصوب صبغۃ کا محذوف فعل صیغہ امر میں ہونا موزوں ہے۔

اسی کے مماثل اسلوب میں قرآن میں بعض جگہ وعد اللہ منصوب آیا ہے۔ وہاں موقع و محل کا تقاضا یہ ہے کہ مخاطبین اس دھمکی سے ڈریں جو ان کو دی جا رہی ہے۔ ان مقامات پر بھی محذوف فعل صیغہ امر ہی ماننا مناسب ہے۔

۴۔ وقالوا کونوا ھودا و نصاریٰ تھتدوا۔ قل بل ملۃ ابراھیم حنیفا (بقرۃ۔ ۱۳۵)

"اور کہتے ہیں کہ۔ یہود یا نصرانی بنو تو ہدایت پاؤ گے، کہو بلکہ ابراہیم کی ملت (کی پیروی کرو) جو اللہ کی طرف یکسو تھا۔"

یہاں ملت حالت نصب میں ہے اور مفعول ہے۔ آیت کے پہلے حصہ میں۔ یہود و نصاریٰ کی دعوت کا حوالہ ہے۔ دوسرے حصہ میں اس کی تردید میں فرمایا ہے کہ۔ یہودیت و نصرانیت اختیار کرنے کی یہ دعوت گمراہ کن ہے۔ راہ ہدایت کو پانے کے لیے ابراہیم کی ملت کی پیروی کرو۔ یہاں بھی موقع کلام صیغہ امر کا تقاضا کرتا ہے۔

فعل امر کے حذف کی ایک مثال بقرہ کی آیت ۲۴۰ میں ہے۔ اس میں لفظ وصیۃ منصوب ہے۔ مراد یہ ہے کہ وفات پانے والے شوہر بیویوں کے حق میں وصیت چھوڑ جائیں۔ اسی طرح سورہ یونس ۲۳ میں متاع الحیوۃ الدنیا کے اسم منصوب متاع کا فعل محذوف ہے۔ موقع کلام کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو بھی صیغہ امر مانا جائے۔ یعنی چند روزہ دنیا کی زندگی کا نفع اٹھالو۔

۵۔ نقول للذین اشرکوا مکانکم انتم و شرکاؤکم (یونس ۲۸)

"ہم شرک کرنے والوں کو حکم دیں گے کہ تم اور تمہارے شرکاء اپنی جگہ (ٹھہرو)"

یہاں اسم منصوب مکان ظرف کے محل میں ہے۔ اس سے پہلے قفوا یا الکثوا حذف ہے۔ یہ ایک فوری حکم کا موقع ہے۔ ایسے مواقع میں فعل کو بالعموم اس لیے حذف کر دیا جاتا ہے کہ مخاطب کی ساری توجہ حکم پر مرکوز ہو جائے اور وہ اس کی بلا تاخیر بجا آوری کر سکے۔

۶۔ ولقد زینا السماء الدنیا بزینۃ الکواکب و حفظا من کل شیطٰن مارد (صافات۔ ۷)

"بے شک ہم ہی نے سجایا ہے آسمان زیریں کو ستاروں کی زینت سے اور (اس کو محفوظ کیا ہے) اچھی طرح ہر سرکش شیطان کی دراندازی سے۔"

اس آیت میں حفظا مصدر ہے جو تاکید اور مبالغہ کے معنی دے رہا ہے۔ اس کا متعلق فعل اسی مادہ سے حفظنا محذوف ہے۔ مصدر کا وجود خود اس فعل کا پتہ دے رہا تھا اس لیے اس کو حذف کر دیا۔

۷۔ وانی کلما دعوتھم لتغفر لھم جعلوا اصابعھم فی اذانھم واستغشوا ثیابھم واصروا واستکبروا استکبارا ثم انی دعوتھم جھارا ثم انی اعلنت لھم و اسررت لھم اسرارا (نوح ۷۔ ۹)

"میں نے جب جب ان کو توبہ کی دعوت دی کہ تو ان کو بخشے تو انہوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس لیں، اپنی چادریں اپنے اوپر لپیٹ لیں، اپنی ضد پر اڑ گئے اور نہایت گھمنڈ کا اظہار کیا۔ پھر میں نے ان کو ڈنکے کی چوٹ پکارا۔ پھر میں نے ان کو کھلم کھلا بھی سمجھایا اور چپکے چپکے بھی"۔

یہ حضرت نوح علیہ السلام کی اس دعا کی تمہید ہے جس میں انہوں نے اپنی قوم پر فیصلہ کن عذاب کی درخواست کی۔ یہاں اسلوب کلام کا تقاضا تھا کہ "اصروا اصرارا" اور "اعلنت لھم اعلانا" ہوتا لیکن چونکہ ساتھ آنے والے فعل میں مصدر (استکبارا اور اسرارا) ظاہر کر دیا گیا تھا۔ اس لیے یہاں حذف کر دیا گیا تاکہ کلام میں ثقل نہ پیدا ہو جائے۔

د۔ اذ، ذلک اور کذلک کے ساتھ فعل کا حذف:

۱۔ اذ ظرف زمان کا مفہوم دیتا ہے۔ اس کے تحت بالعموم ماضی کے کسی واقعہ کا حوالہ دیا جاتا ہے اور مراد یہ ہوتی ہے کہ اس واقعہ کو یاد کرو یا خیال کرو جب یوں ہوا۔ گویا اس سے قبل ایک فعل امر محذوف ہوتا ہے۔ اذ کے استعمال کی بکثرت مثالیں موجود ہیں۔ ایک مثال واذا خذنا میثاقکم (بقرہ ۹۳) اوپر بیان ہو چکی ہے۔

۲۔ ذلک اسم اشارہ ہے۔ بعض مقامات پر محض یہی اسم ایک جملہ کا قائم مقام ہو کر آیا ہے۔ جن باتوں کی طرف اشارہ ہوتا ہے وہ اوپر سلسلہ کلام میں بیان ہو چکی ہوتی ہیں اور اب محض ان کا خیال و اہتمام رکھنے پر ابھارنا مقصود ہوتا ہے لیکن فعل امر کو حذف کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً فرمایا

ذلک ومن یعظم حرمت اللہ فھو خیر لہ عند ربہ (حج۔ ۳۰)

"ان امور کا (اہتمام رکھو) اور جو حرمات الٰہی کی تعظیم کرے گا تو اس کے رب کے نزدیک یہ اس کے حق میں بہتر ہے۔"

اوپر حج کے سلسلہ میں کچھ ہدایت دی گئی ہیں۔ اب ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ابھارا ہے کہ ان باتوں کو اچھی طرح سن اور سمجھ لو اور ان کا اہتمام رکھو لیکن اس مضمون کو ادا کرنے والا فعل محذوف ہے۔ اس کے مماثل اسلوب آگے آیت ۳۲ میں استعمال ہوا ہے۔

۳۔ ذلک کی طرح کذلک بھی قرآن میں ایک جملہ کا قائم مقام ہو کر آیا ہے اور اس کا متعلق فعل حذف ہے۔ مثلاً فرمایا

کذلک واورثناھا بنی اسرائیل (شعرا ۵۹)

"اسی طرح (ہم کرتے ہیں) اور ہم نے ان چیزوں کا وارث بنایا بنی اسرائیل کو"۔

اس آیت سے قبل فرعونیوں کی تباہی کا ذکر ہے۔ یہاں کہا کہ رسولوں کے مکذبین کے ساتھ ہمارا

رویہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ یعنی کذلک نفعل بالمکذبین۔

ہ۔ فعلیہ جملے کا حذف:

بسا اوقات موقع کلام کے پیش و عقب میں ایسی وضاحتیں موجود ہوتی ہیں جن کی بدولت کسی معنی کے اظہار کے بغیر بھی وہ معنی گرفت میں آ رہا ہوتا ہے۔ ایسے موقع پر قاری کی ذہانت پر اعتماد کرتے ہوئے اس معنی کو ادا کرنے والا جملہ حذف کر دیا جاتا ہے اور اس کو سیاق و سباق کی روشنی میں سمجھا جاتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

۱۔ کان الناس امۃ واحدۃ فبعث اللہ النبیین مبشرین و منذرین و انزل معھم الکتب بالحق لیحکم بین الناس فیما اختلفوا فیہ (بقرہ ۲۱۳)

"لوگ ایک ہی امت بنائے گئے۔ (انہوں نے اختلاف پیدا کیا) تو اللہ نے انبیاء بھیجے جو خوشخبری سناتے اور خبردار کرتے ہوئے آئے۔ اور ان کے ساتھ کتاب بھیجی قول فیصل کے ساتھ تاکہ جن باتوں میں لوگ اختلاف کر رہے ہیں ان میں فیصلہ کر دے"۔

یہاں انبیاء کی بعثت کا مقصد امتوں کے مابین پیدا ہونے والے اختلاف کو رفع کرنا بتایا لیکن آغاز کلام میں اس اختلاف کا تذکرہ نہیں آیا بلکہ امتوں کی وحدت کا ذکر ہے۔ آخر آیت میں رسولوں کی بعثت کی مصلحت کے طور پر امتوں کے اختلاف کا ذکر آ رہا تھا اور اگر شروع میں بھی اس کا بیان آتا تو یہ تکرار ناگوار ہوتی اس لیے امۃ واحدۃ کے بعد فاختلفوا کا جملہ حذف کر دیا گیا۔ گویا مراد یہ ہے کہ امتوں میں وحدت تھی، پھر ان میں اختلاف پیدا ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اس اختلاف کو رفع کرنے کے لیے رسول مبعوث کیے۔

۲۔ فان خفتم فرجالا او رکبانا (بقرہ ۲۳۹)

"اگر تم خطرے کی حالت میں ہو تو پیدل یا سوار (نماز ادا کرو)"

اس آیت سے قبل نماز کی محافظت اور اللہ کے حضور فرمانبردارانہ کھڑے ہونے کا حکم الفاظ میں موجود ہے۔ خطرے کی حالت میں چونکہ نماز کے آداب و شرائط کو ہمیشہ ملحوظ رکھنا ممکن نہیں ہوتا اس لیے پیدل یا سوار جس صورت میں ممکن ہو نماز ادا کرنے کی اجازت دی۔ چونکہ موقع و محل سے واضح تھا کہ نماز ادا کرنے کا حکم ہے اس لیے جملہ کا اتنا حصہ حذف کر دیا۔

۳۔ قل بفضل اللہ و برحمتہ فبذلک فلیفرحوا (یونس ۵۸)

"کہہ دو کہ یہ اللہ کے فضل و رحمت سے (نازل ہوا ہے) تو چاہیے کہ اس پر شادمان ہوں"۔

موقع و محل قرآن مجید کے نزول کا احسان جتانے کا ہے۔ یہ مضمون چونکہ واضح تھا اس لیے انزل یا

جا۔ یا اس کے ہم معنی کوئی اور فعل حذف کر دیا کیونکہ اس کی وضاحت کی ضرورت نہ تھی۔ جملے کا خلا بھرنا قاری کے بس میں تھا۔

۴۔ قد نعلم انہ لیحزنک الذی یقولون فانھم لا یکذبونک ولکن الظلمین بایات اللہ یجحدون (انعام ۳۳)

" ہم آگاہ رہے ہیں کہ جو کچھ یہ کہتے ہیں اس سے تم کو غم ہوتا ہے (تو صبر کرو) کیونکہ یہ تمہیں نہیں جھٹلا رہے ہیں بلکہ یہ ظالم تو اللہ کی آیات کا انکار کر رہے ہیں۔"

اس جملہ کا خلا ایک قاری فوراً محسوس کر لیتا ہے۔ جب تک اس خلا کو نہ بھرا جائے فانھم سے آگے کا جملہ بے مقصد ہو جاتا ہے۔ اس خلا کو صبر کی تلقین یا اسی کے ہم معنی کسی اور مضمون سے بھرا جا سکتا ہے۔ آیت میں مضارع سے پہلے قد آنے کا تقاضا یہ ہے کہ مضارع کو ماضی استمراری کے معنی میں لیا جائے۔ چنانچہ یہاں بھی فعل ناقص کنا محذوف ہے۔ یعنی قد کنا نعلم۔

و۔ لام سے پہلے حذف :

بسا اوقات کسی فعل پر لام آ کر یہ ظاہر کر رہا ہوتا ہے کہ یہ فعل کسی عمل کا نتیجہ بیان کر رہا ہے لیکن اوپر کوئی ایسا لفظ موجود نہیں ہوتا جس سے وہ فعل ظاہر ہوتا ہو۔ اصل میں اس صورت میں بھی ایک فعل محذوف ہوتا ہے اور اس کی موجودگی پر وہی "ل" قرینہ مہیا کرتا ہے۔ سلسلہ کلام پر غور سے محذوف فعلیہ جملہ بآسانی سمجھ میں آ جاتا ہے۔ مثلاً

۱۔ ثم نخرجکم طفلا ثم لتبلغوا اشدکم (حج ۵)

" پھر ہم تم کو ایک بچہ کی شکل میں برآمد کرتے ہیں پھر (ایک وقت دیتے ہیں) تاکہ تم جوانی کو پہنچو"۔

یہاں بھی دوسرے ثم کے بعد ایک خلا محسوس ہوتا ہے کہ " ہم مہلت دیتے ہیں" یا "موقع عطا کرتے ہیں" تاکہ بچہ جوان ہو جائے۔ لتبلغوا میں لام کا موجود ہونا اس محذوف کا قرینہ مہیا کرتا ہے کیونکہ اس میں نتیجہ بتایا گیا ہے۔ اصل فعل نہیں بتایا گیا۔

۲۔ ولو تواعدتم لاختلفتم فی المیعد ولکن لیقضی اللہ امرا کان مفعولا (انفال ۴۲)

" اور اگر تم باہم میعاد ٹھہرا کر نکلتے تو میعاد پر پہنچنے میں ضرور مختلف ہو جاتے لیکن (اللہ نے فرق نہ ہونے دیا) تاکہ اللہ اس امر کا فیصلہ فرما دے جس کا ہونا طے پا چکا تھا۔"

یہاں لکن کے بعد حذف ظاہر ہے۔ آگے لام کا موجود ہونا اس کا قرینہ فراہم کرتا ہے۔ آخری جملہ محذوف جملے کا فائدہ بیان کر رہا ہے۔

۳۔ فاذا جاء وعد الاخرۃ لیسوء وا وجوھکم ولیدخلوا المسجد (بنی اسرائیل ۔ ۷)

" پھر جب پچھلی بار کی میعاد آتی ہے تو (ہم تم پر اپنے زور آور بندے مسلط کر دیتے ہیں) تاکہ وہ تمہارے چہرے بگاڑ دیں اور مسجد میں گھس جائیں۔"

یہاں بنی اسرائیل کی تاریخ میں بیت المقدس کی تباہی کے دوسرے موقع کا حوالہ ہے۔ لیسوء وا سے پہلے مضمون کا حذف بالکل عیاں ہے کیونکہ آیت کا ابتدائی حصہ شرطیہ ہے اور جواب شرط موجود نہیں۔ آگے لام اس حذف کا قرینہ ہے۔ اوپر آیت ۵ میں بیت المقدس کی تباہی کے پہلے موقع کا ذکر کرتے ہوئے بتایا تھا کہ طاقتور دشمن تم پر مسلط کر دیا گیا تھا۔ وہی مضمون یہاں حذف ہے کیونکہ قاری کا ذہن فوراً اوپر کی بات کی طرف ہو سکتا تھا۔

ز۔ مشابہ فعل کا حذف :

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دو یا دو سے زیادہ مفعول حرف عطف کے ساتھ جمع ہو کر آتے ہیں۔ ان میں سے ایک کے ساتھ متعلق فعل کو بیان کیا جاتا ہے جبکہ باقی مفعولوں کا متعلق فعل حذف کر دیا جاتا ہے۔ ایسے موقع پر مناسبت رکھنے والا محذوف فعل قرینہ سے سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً

۱۔ واعبدوا اللہ ولا تشرکوا بہ شیا وبالوالدین احسانا (نساء ۳۶)

" اور اللہ ہی کی بندگی کرو اور کسی چیز کو بھی اس کا شریک نہ ٹھہراؤ اور والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔"

یہاں دو مفعول اللہ اور والدین ہیں۔ اللہ کے ساتھ بندگی کا فعل مناسبت رکھتا ہے لیکن والدین کے لیے یہ موزوں نہیں۔ ان کا حق حسن سلوک کا ہے۔ اس کو ادا کرنے والا فعل، احسنوا، حذف کر دیا گیا جس کا قرینہ مصدر احسانا مہیا کر رہا ہے۔

۲۔ تعالوا ندع ابناءنا وابناءکم ونساءنا ونساءکم وانفسنا وانفسکم ثم نبتھل (آل عمران ۶۱)

" آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلالیں تم اپنے بیٹوں کو بلالو، ہم اپنی عورتوں کو بلالیں تم اپنی عورتوں کو بلالو، ہم اپنے آپ کو حاضر کریں تم اپنے آپ کو حاضر کرو، پھر ہم مل کر بددعا کریں۔"

یہاں فعل ندع میں بلانے کا فعل بیٹوں اور عورتوں کے لیے موزوں ہے، باہم معاملہ کرنے والوں کی ذات کے لیے مناسبت نہیں رکھتا۔ ان کے لیے مناسب فعل خود کو حاضر کرنا ہے۔ گویا نحضر انفسنا وتحضرون انفسکم مراد ہے۔ لیکن اس کو حذف کر دیا تاکہ قاری اپنے فہم سے اس کو متعین کرے۔

۳۔ والذین تبوء وا الدار والایمان من قبلھم یحبون من ھاجر الیھم (حشر ۹)

" اور جو لوگ پہلے سے ٹھکانے بناتے ہوئے تھے اور ایمان (استوار کیے ہوئے تھے) وہ دوست رکھتے ہیں ان کو جو ہجرت کر کے ان کی طرف آ رہے ہیں۔"

یہاں مدینہ کے انصار کی تعریف فرمائی ہے۔ آیت میں دار اور ایمان حرف عطف سے جمع ہیں لیکن تبوء وا (ٹھکانہ بنانا) ایمان کے لیے موزوں لفظ نہیں۔ اس سے مناسبت رکھنے والا فعل قاری کے فہم پر اعتماد کرتے ہوئے حذف کر دیا گیا ہے۔ مثلاً احکموا الایمان (ایمان کو محکم بنایا)

۳۔ و القیٰ فی الارض رواسی ان تمید بکم و انھارا و سبلا لعلکم تھتدون و علمت و بالنجم ھم یھتدون (النحل ۱۵-۱۶)

" اور اس نے زمین میں پہاڑ ڈال دیے ہیں کہ وہ تمہیں لے کر جھک نہ پڑے اور نہریں (جاری کر دی ہیں) اور راستے (نکال دیے ہیں) تاکہ تم راہ پاؤ اور دوسری علامتیں (بھی مقرر کر دی ہیں) اور ستاروں سے بھی وہ راہ معلوم کرتے ہیں"۔

یہاں صرف پہلے مفعول رواسی کا فعل القیٰ ظاہر کیا جب کہ باقی تمام مفعولوں۔ انہار، سبل۔ علامت۔ کے متعلق فعل حذف کر دیے ہیں۔ مثلاً اجری انھارا و مھد سبلا و جعل للسبیل علمت۔ ان کو قاری اپنے فہم سے متعین کر سکتا ہے۔

بقیہ : زمینوں کے متعلق فیصلے

قریب تر ہو۔ باغ کے مالک نے انہیں اس سے روک دیا۔ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے حضرت عمرؓ سے بات کی تو انہوں نے نالی کا رخ پھیرنے کے معاملہ میں حضرت عبدالرحمن بن عوف کے حق میں فیصلہ دے دیا۔

وضاحت:

انسان ہمیشہ انسان رہتا اور جذباتی کیفیات کی زد میں رہتا ہے۔ یہ بھی ہے کہ انسان کو ملکیت کا کچھ غلط تصور ہو جاتا ہے اور وہ اخلاقی حدود کو پہچانتے سے قاصر رہ جاتا ہے۔

بات اس روایت میں بھی وہی ہے جو پچھلی روایت میں ہے کہ جب ایک شخص کو دوسرے کو کوئی سہولت مہیا کرنے سے نقصان نہ ہوتا ہو تو اسے اپنے پڑوسی کو فائدہ پہنچانا چاہیے۔ اسے اپنی ملکیت کے باعث رکاوٹ پیدا کرنے کا کوئی حق نہیں۔ یہ سب قوانین زمینداری اور کارپوریشن سے متعلق ہیں۔

(ترجمہ: سعید احمد)

تالیفات امام حمید الدین فراہیؒ

		پیسے روپے
1۔	مجموعہ تفاسیر فراہی	176-00
2۔	حکمت قرآن	00-00
3۔	اقسام القرآن	00-00
4۔	ذبیح کون ہے	00-00

تالیفات مولانا امین احسن اصلاحی

1۔	تدبر قرآن: (۹ جلد)	1584-00
	: (فی جلد)	176-00
2۔	مبادی تدبر قرآن	63-00
3۔	مبادی تدبر حدیث	54-00
4۔	حقیقت شرک و توحید	78-00
5۔	حقیقت نماز	33-00
6۔	حقیقت تقویٰ	33-00
7۔	تزکیہ نفس: جلد اول (شائع کردہ ملک سنز)	60-00
	: جلد دوم	63-00
8۔	دعوت دین اور اس کا طریق کار	66-00
9۔	اسلامی قانون کی تدوین	42-00
10۔	اسلامی ریاست	00-00
11۔	اسلامی ریاست میں فقہی اختلافات کا حل	42-00
12۔	اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام	63-00
13۔	قرآن میں پردے کے احکام	8-00
14۔	فلسفے کے بنیادی مسائل قرآن حکیم کی روشنی میں	66-00
15۔	تفہیم دین	54-00
16۔	مقالات اصلاحی: جلد اول	87-00
	: جلد دوم	00-00
	: جلد سوم	00-00

فاران فاؤنڈیشن
122۔ فیروز پور روڈ، اچھرہ لاہور۔ 54600 پاکستان، فون: 042-48080[illegible]